فہرست

لمعات:

جنابِ چیف جسٹس کی توجہ کے لئے!	ادارہ	3
اقبالؒ کی کہانی خود اقبالؒ کی زبانی	پرویزؒ	4
غلام احمد پرویز سے علامہ اقبالؒ کے متعلق خصوصی انٹرویو	ایم۔ایس۔ناز	25
عیدالضحیٰ	ادارہ	33
''بیگارستان اور بھکارستان کی داستان	محمد عمر لاہور	38
اہمیت قبلہ	خواجہ ازہر عباس فاضل درسِ نظامی	40
ایں چنیں ارکانِ دین.....	سید سلیم شاہ	46

ENGLISH SECTION

DEEPAK CHOPRA'S CLOAKED ASSAULT ON ISLAM
By Abdus Sattar Ghazali 1

اشاریہ مجلّہ طلوع اسلام

محترم غلام احمد پرویز کی زیرنگرانی ماہنامہ طلوع اسلام کا 1938ء میں اجراء ہوا۔ جس میں مختلف موضوعات پر وقیع علمی و تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے۔ اس تاریخی مجلّہ کے مندرجات و مضامین کا تفصیلی اشاریہ 1938ء تا 1990ء ایک خوبصورت کتاب کی شکل میں دستیاب ہے۔ بڑے سائز کے تقریباً ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل اس دستاویز کی قیمت صرف 300 روپے علاوہ ڈاک خرچ ہے۔ ادارہ طلوع اسلام سے دستیاب ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

جنابِ چیف جسٹس کی توجہ کے لئے!

قرآن کے صریح احکام کی روشنی میں سوچئے کہ آج ہماری حالت کیا ہے؟ اس وقت جو لوگ فیصلے دینے کے مدعی ہیں ان کے دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جو ملک کے لئے قانون بناتے ہیں اور دوسرے وہ جو شریعت کے مطابق فتوے دینے یا قانون بنانے کے مدعی ہیں۔ قانون بنانے والوں کی حالت یہ ہے کہ ان کو اس کا قطعاً خیال نہیں کہ قانون **ماانزل اللہ** (قرآن) کے مطابق بننا چاہئے اور شرعی فتوے دینے والوں کی حالت یہ ہے کہ خود **ماانزل اللہ** (قرآن) کے مطابق فتوے دینا تو ایک طرف، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے فیصلے **ماانزل اللہ** (قرآن) کے مطابق ہونے چاہئیں وہ انہیں کافر اور مرتد قرار دیتے ہیں۔

لہٰذا حالت یہ ہے کہ نہ فیصلہ کرنے والے **ماانزل اللہ** (قرآن) کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں، نہ ہی ایسا فیصلہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور نہ ہی فیصلہ کرانے والے اس پر اصرار کرتے ہیں کہ ان کے فیصلے **ماانزل اللہ** (قرآن) کے مطابق ہونے چاہئیں۔

اب سوچئے کہ اگر اس قسم کی قوم نمازیں پڑھے، روزے رکھے، زکوٰۃ دے، حج کرے تو خدا کی میزان میں اس کے ان اعمال کا کوئی وزن ہو سکتا ہے؟ سنئے کہ قرآن ان کے متعلق کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًا بَعِیْدًا (4:60)-

کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا ہے جو بزعم خویش سمجھتے یہ ہیں کہ ہم اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اللہ نے تیری طرف نازل کی اور ان پر بھی جو تجھ سے پہلے نازل کی گئیں اور ان کی عملی کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خدا کے قانون کی رو سے کرتے اور کراتے ہیں۔ حالانکہ ان سے کہا یہ گیا تھا کہ وہ ہر غیر خداوندی قانون سے انکار کریں (اور اپنے فیصلے **ماانزل اللہ** (قرآن) کے مطابق کرائیں) ہم نے یہ حکم دیا تھا اور شیطان یہ چاہتا تھا کہ ان لوگوں کو اس راستہ سے کہیں دور لے جائے۔

یاد رکھئے کہ آج ایمان کی طرف لے جانے والا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہم کوشش کریں کہ قوم کا اوپر کا طبقہ **ماانزل اللہ** (قرآن) کے مطابق فیصلے کرنے کا قانون بنائے اور فیصلے کرانے والا طبقہ اپنے فیصلے **ماانزل اللہ** (قرآن) کے مطابق کرائے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویزؒ

اقبالؒ کی کہانی خود اقبالؒ کی زبانی

یہ ''کہانی'' سوانحعمری نہیں ہے جس میں ترتیبِ واقعات کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ یہ صرف اقبالؒ کے قلب و دماغ کی مختلف کیفیتوں کا مطالعہ ہے جسے زمان و مکان کی قیود سے الگ ہٹ کر پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس ''کہانی'' کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھئے۔ (طلوع اسلام)

برادرانِ عزیز!

علامہ اقبالؒ نے اپنے آخری کلام' ارمغانِ حجاز میں کہا ہے کہ

چو رختِ خویش بربستم ازیں خاک
ہمہ گفتند باما آشنا بود!
و لیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

جب کیفیت یہ ہے کہ خود اقبالؒ کے اپنے اندازے کے مطابق' کوئی شخص اقبالؒ کی حقیقت سے کماحقہٗ واقف نہیں ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حقیقی اقبالؒ کی جھلک دیکھی کہاں سے جائے؟ اس سوال کا جواب چنداں مشکل نہیں۔ اس لئے کہ اقبالؒ خود اپنے متعلق اتنا کچھ کہہ گیا ہے کہ اس سے ان کی پوری تصویر نگۂ تجسس کے سامنے آ جاتی ہے۔ میرے لئے یہ تو مشکل ہے کہ اس مختصر سے وقت میں اس تصویر کے تمام گوشوں کی تفاصیل آپ کے لئے جنت نگاہ بنا سکوں۔ اس وقت صرف اتنا ہو سکے گا کہ اس کے ابھرے ہوئے نقش و نگار اور نمایاں خط و خال سامنے لائے جا سکیں۔ اس مرقعِ نگہ تاب اور پیکرِ خوش انداز کی تفصیلی گل کاریوں اور جلوہ طرازیوں کو میں نے اپنی اس تالیف کے لئے اٹھا رکھا ہے جو اقبال اور قرآن' کے عنوان سے میرے پیشِ نظر ہے اور جسے میں' حضرت علامہ کے ان احساناتِ عظیم کے زیرِ احساس' جن سے میری نگہ تشکر ہمیشہ نگوں سار ہے' اپنے ذمہ ایک قرض سمجھتا ہوں۔ خدا مجھے اس قرض حسنہ سے سبکدوش ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

اس وقت میری دوسری مشکل یہ ہے کہ حضرت علامہ کے کلام کا بیشتر حصہ فارسی میں ہے اور اس قسم کا مخلوط مجمع فارسی زبان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مجھے مجبوراً ان

کے اردو کلام ہی پر اکتفا کرنا ہوگا اور فارسی اشعار صرف ان مقامات پر پیش کئے جائیں گے جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو۔

انیسویں صدی کے آخرِ شب کے ستار سے جھلملا رہے ہیں اور بیسویں صدی کی نازنینۂ سحر انگڑائیاں لے رہی ہے۔ قلبِ زندہ دلانِ پنجاب' یعنی لاہور کی کیف بار فضائیں' شباب و شعر کی نکہتوں اور رنگ و نظر کی نزہتوں سے دامانِ باغبان و کفِ گل فروش کا منظر پیش کر رہی ہیں۔ گورنمنٹ کالج کی درسگاہ اپنے معیارِ تعلیم کی بلندی کے ساتھ ساتھ دولت مند خاندانوں کے عشرت پسند نونہالوں کی لاابالیوں کے لئے دور دور تک شہرت حاصل کر چکی ہے' کہ اتنے میں سیالکوٹ کے ایک متوسط خاندان کا نہایت ذہین طالب علم اس حیرت کدۂ علم و تماشا میں آ نکلتا ہے۔ شروع شروع میں جہاں وہ نوجوان اس فضا کو اپنے لئے غیر مانوس پاتا ہے' وہاں خود وہ فضا بھی اس نووارد کو اجنبی سا محسوس کرتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ نووارد طالب علم اپنی سحر طرازیوں سے اس پوری فضا پر چھا جاتا ہے اور جس محفل میں شریک ہو جاتا ہے اسے تبسم فشاں و قہقہہ بار بنا دیتا ہے۔ تعلیمی منازل میں اس کا یہ عالم ہے کہ اساتذہ اس کا معلم کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ دوستوں کی مجلس میں یہ کیفیت ہے کہ ہر شخص اس سے قریب تر ہونے میں ایک خاص نشاطِ روح محسوس کرتا ہے۔ اس کی شرکت سے شعر و سخن کی محفلوں میں ایک تازہ حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ محسوس ہونے لگ جاتا ہے کہ اس سے پیشتر لاہور محض ایک پیکرِ آب و گل تھا اور اس میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ پہلے پہل ابھی مسکرائی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نوجوان کی حالت یہ ہے کہ وہ اس محفل طرب و نشاط کے کسی ساز کو اپنا ہم آہنگ اور اس گلکدۂ حسن و تماشا کے کسی پھول کو اپنا ہمرنگ نہیں دیکھتا۔ اسے ہر ایک اپنا ہمنوا اور ہم ذوق سمجھتا ہے لیکن وہ کسی کو بھی اپنا ہم صفیر و ہم نگاہ نہیں پاتا۔ اس کی شرکت سے اجڑی ہوئی محفلوں پر بھی بہار آ جاتی ہے لیکن یہ بھری محفلوں میں بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی شے کی جستجو ہے جس نے اسے سراپا اضطراب بنا رکھا ہے۔ کوئی خلش تجسس ہے جو اسے کسی پہلو چین نہیں لینے دیتی۔ وہ اپنی تشنگیٔ ذوق کی تسکین کے لئے ہر دور سے نظر آنے والے چشمہ کی طرف لپکتا ہے لیکن اسے سراب پا کر مضطرب و بیقرار واپس آ جاتا ہے۔ وہ کبھی اسی تسکین خاطر کے لئے لارنس گارڈن میں جا نکلتا ہے لیکن اس جہان رنگ و بو کی جمال افروز شادابی و شگفتگی بھی اس کے لئے جاذب نگاہ نہیں بنتی۔ وہ ایک حسین شاخ پر چہچہانے والے ''گل رنگین'' کو نہایت غور سے دیکھتا اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں
اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں

زیبِ محفل ہے، شریکِ شورشِ محفل نہیں
یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں
اس چمن میں، میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو
سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے
راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے
میری صورت تو بھی اِک برگِ ریاضِ طور ہے
میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے
مطمئن ہے تو، پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں
زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

ہوسکتا تھا کہ وہ اس خلشِ پیہم اور سوزِ مسلسل کے ہاتھوں تنگ آ کر اپنی زندگی کا رُخ بدل لیتا لیکن کوئی بے صوت صدا ہے جو چپکے ہی چپکے اس کے کان میں کہہ دیتی ہے اور وہ خود ہی پکار اٹھتا ہے کہ نہیں! مجھے گھبرانا نہیں چاہئے۔ کہیں

یہ پریشانی مری سامانِ جمعیت نہ ہو؟
یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو؟
ناتوانی ہی مری سرمایۂ قوت نہ ہو؟
رشکِ جامِ جم میرا آئینۂ حیرت نہ ہو؟
یہ تلاشِ متصل، شمعِ جہاں افروز ہے
توسنِ ادراکِ انساں کو خرامِ آموز ہے

یہ تسکین اسے پھر آمادۂ تجسس کر دیتی اور وہ ہلاکِ ذوقِ جستجو پھر اسی تپش و خلش کے لئے سیماب پا ہو جاتا۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ بالآخر اس سوزِ پیہم اور خلشِ مسلسل کی وجہ کیا ہے؟ ہر شخص نے اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصود متعین کر رکھا ہے اور اس کا دل اس سے مطمئن ہے لیکن ایک تم ہو کہ تمہیں کسی پہلو قرار ہی نہیں۔ کوندے کی لپک کی طرح یہاں سے وہاں، اور شعلے کی تڑپ کی طرح وہاں سے یہاں۔ وہ سب کچھ سنتا اور ایک آہ بھر کر کہہ دیتا کہ

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسا زد
دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروئے
تپدآں زماں دل من پئے خوب تر نگارے
نہ شرر ستارہ جوئم، زستارہ آفتابے
سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلسم نہایتِ آں کہ نہایتے نہ دارد
بہ نگاہ نا شکیبے، بدلِ امیدوارے

اس کی فطرت کی یہی سیمابیت اور ذوقِ جستجو کی اضطرابیت تھی جو اسے ہر محفل میں دیوانہ وار لئے لئے پھرتی تھی۔ کبھی حکمت و فلسفہ کی خشک گھاٹیوں میں، کبھی شعر و ادب کی شاداب وادیوں میں، کبھی مسجد و خانقاہ کی خلوتوں میں اور کبھی محفل رنگ و چنگ کی جلوتوں میں اور یہ سب کچھ اس بے باکانہ اعتراف کے ساتھ کہ

مُدتے با لالہ رویاں ساختم
عشق با موغولہ مویاں بافتم

بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم
بر چراغِ عافیت داماں زدم

چنانچہ اس کی یہ ہر رہ نوروی اور ہر منزل نشینی کی کیفیت جسے قرآن نے **فی کل وادیھیمون** کی شاعرانہ نفسیاتی کیفیت سے تعبیر کیا ہے، دیکھنے والوں کے دل میں اس کے متعلق عجیب وغریب خیالات پیدا کیا کرتی۔ اسی کیفیت کو ایک مولوی صاحب کی زبان سے سنئے جو اس زمانہ میں اقبالؒ کی ہمسائیگی میں رہتے تھے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبالؒ کہ ہے قمریٔ شمشادِ معانی
پابندیٔ احکامِ شریعت میں ہے کیسا؟
گو شعر میں ہے رشکِ حکیم ہمدانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اُڑانی
کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعراء کی ہے پُرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کُھلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سُنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی

☆☆☆

اس شہر میں جو بات ہو اُڑ جاتی ہے سب میں
میں نے بھی سُنی اپنے احبّا کی زبانی
اِک دن جو سرِ راہ ملے حضرت زاہد
پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے
یہ آپ کا حق تھا زرہِ قرب مکانی
گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبالؒ کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبالؒ بھی اقبالؒ سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

واعظ کو اس قسم کے مسلک سے وجۂ شکایت بجا تھی لیکن حیرت تو یہ ہے کہ اس باب میں رندانِ میکدہ بھی کچھ کم گِلہ طراز نہ تھے۔ ان کی بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اقبالؒ ہے کیا؟ وہ بھی یہ کہتے تھے کہ

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبالؒ تو
رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے، تنہا بھی ہے
عین شغلِ مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز
کچھ ترے مسلک میں رنگِ مشربِ مینا بھی ہے
ہے حسینوں میں وفا ناآشنا تیرا خطاب
اے تلون کیش! تو مشہور بھی رسوا بھی ہے
لے کے آیا ہے جہاں میں عادتِ سیماب تو
تیری بے تابی کے صدقے! ہے عجب بیتاب تو

یہ سن کر اقبالؒ مسکراتا اور کہتا کہ

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے
مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبا رکھتا ہوں میں
آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے
مضطرب ہوں، دل سکوں نا آشنا رکھتا ہوں میں
فیضِ ساقی شبنم آسا، ظرفِ دل دریا طلب
تشنۂ دائم ہوں، آتش زیرِ پا رکھتا ہوں میں

خلشِ آرزو سے اقبالؒ کی یہ آشفتگی روز بروز بڑھتی گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے سینۂ شعلہ ساماں و آذر فشاں میں جو حشر بپا ہو رہا ہے اسے اپنے ہم جلیس احباب کو کس طرح دکھائے! یہی وجہ تھی کہ وہ بھری محفل میں بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا تھا اور یہ تنہائی اسے رہ رہ کر ستاتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزہ جینے میں
کچھ مزہ ہے تو اسی خونِ جگر پینے میں
کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں میرے سینے میں
اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہیں وہ لالے ہی نہیں

اسے تلاش تھی کسی ایسے محرم راز کی جو اس کی سنتا اور اسے سمجھتا۔ لیکن اسے کہیں ایسا ہمنوا نہیں ملتا تھا حتیٰ کہ وہ اپنی تلاش میں تھک کر کہہ اٹھتا کہ

یہاں کہاں ہم نفس میسر، یہ دیس نا آشنا ہے اے دل
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیرِ چرخِ کہن نہیں ہے

اسے اس تنہائی کا احساس آخر تک رہا۔ اس لئے کہ وہ جس دیس کی بولی بولتا تھا اسے سمجھنے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ اس لئے وہ ہر راہرو سے کہتا کہ

غریبِ شہر ہوں میں، سن تو لے مری فریاد
کہ تیرے سینے میں بھی ہوں قیامتیں آباد
مری نوائے غم آلود ہے متاعِ عزیز
جہاں میں عام نہیں دولتِ دلِ ناشاد
گلہ ہے مجھ کو زمانے کی کور ذوقی سے
سمجھتا ہے میری محنت کو محنتِ فرہاد
صدائے تیشہ کہ برسنگ می خورد دِگر است
خبر بگیر کہ آوازِ تیشہ و جگر است

یہ تنہائی بعض اوقات اس قدر شدت اختیار کر جاتی کہ وہ سمجھتا کہ وہ کسی اور دنیا کا انسان ہے جو بھولے بھٹکے یہاں چلا آیا ہے۔ وہ راتوں کی تنہائیوں میں اٹھ اٹھ کر روتا اور خدا سے کہتا کہ

دریں میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر
کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

لیکن اس تنہائی کے باوجود، کسی فردوسِ گم گشتہ کی تلاش تھی جو اسے ہر وقت گوشہ بگوشہ لئے لئے پھرتی تھی۔ تلاشِ حقیقت کی یہی خلش بے پایاں تھی جو اسے دانشکدۂ فرنگ میں لے

گئی۔ وہاں پہنچ کر ایک اور کشمکش شروع ہوگئی یا یوں کہئے کہ اس کی دیرینہ کش مکش کی نوعیت متعین ہو گئی۔ اقبالؒ کی کیفیت یہ تھی کہ ابتدائی تعلیم و تربیت کے اثر سے ایمان اس کے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا تھا۔ اس کے تحت الشعور میں اس کے نقوش بہت گہرے تھے۔ لیکن دماغی طور پر وہ ابھی تک یکسر فلسفی تھا۔ فلسفہ سے اسے شغف بھی خاص تھا۔ مغرب میں پہنچے تو وہاں کے فلاسفرز کی صحبت اور تعلیم نے اس شغف کو اور گہرا کر دیا۔ لیکن اس سے ہوا یہ کہ جو کچھ قلب کی گہرائیوں میں بلا دلیل و برہان جاگزیں تھا فلسفہ اس کی تائید نہیں کرتا تھا اور جو کچھ فلسفیانہ دلائل و براہین سے ثابت ہوتا تھا' اس کی گواہی دل نہیں دیتا تھا۔ دل اور دماغ کی یہی وہ کش مکش تھی جو آگے چل کر مشرق و مغرب کی کش مکش کے نام سے ابھری۔ یہی وہ کشمکش ہے جو اقبالؒ کے سارے پیغام میں مختلف اصطلاحات سے سامنے آتی ہے۔ عقل اور عشق' دل اور دماغ' خرد و جنوں' علم و حضور' خبر و نظر' ذکر و فکر' رازی و رومی' ابلیس و جبریلؑ مصطفیٰؐ و بولہب' اہرمن و یزداں یہ سب تقابل درحقیقت ادراک و جذبات کی اس کشمکش کے مظہر تھے۔ مغرب میں میکانکی تصور حیات نے انسان کو ایک پیکر آب و گل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دی تھی۔ اس تصور کی رو سے زندگی مادی تبدیلیوں سے وجود میں آجاتی تھی اور انہی اجزا کے پریشان ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ اس کے برعکس' ایمانی تصور حیات کی رو سے حیات انسانی کا سرچشمہ مادہ سے ماوراء تھا اور موت اس کی آخری حد نہیں تھی بلکہ زندگی کی جوئے نغمہ خواں اس کے بعد بھی مسلسل رواں دواں رہتی تھی۔ مغربی سائنس کی رو سے علم کا دائرہ محسوسات کی چار دیواری تک محدود تھا۔ اس کے برعکس ایمانیات کی رو سے علم حقیقی کا سرچشمہ وحی تھا جو سر حد ادراک سے ماوراء تھا۔ مغربی معاشرے کی بنیادیں' تنہا عقل پر استوار تھیں جس کا تقاضا ہر فرد کے اپنے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس' ایمانیات کی رو سے معاشرہ کی اساس' ان مستقل اقدار پر رکھی جاتی تھی جو تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں طور پر نفع و نقصان اور خیر و شر کی میزان ہوتی ہیں۔ عقل کا تقاضا دوسروں کا سب کچھ چھین کر اپنا آپ بنانا تھا لیکن عشق کا تقاضا' دوسروں کی ربوبیت سے اپنے نشو و ارتقاء کا سامان بہم پہنچانا تھا۔ عقل' انسانی زندگی کو سمٹا کر' انفرادی دائرہ میں محبوس کر دیتی تھی۔ عشق اسے پھیلا کر ساری دنیا پر محیط کر دیتا تھا۔ عقل خود بین تھی' عشق جہاں بیں۔ عقل من و تو کے امتیاز سے درخت کو شاخوں اور پتوں میں منقسم دیکھتی تھی۔ عشق کو ہر ذرہ میں آفتاب پنہاں نظر آتا تھا۔ عقل محوِ تماشائے لب بام رہتی تھی۔ عشق' آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑنے کا متقاضی تھا۔ عقل' بولہبی حیلہ جوئیاں سکھاتی تھی اور عشق روحِ مصطفویؐ کا پیامبر تھا اور یہ حقیقت ہے کہ

ستیزہ کار رہائے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرار بو لہبی

عقل و عشق کی یہی کشمکش تھی جس نے دانشکدۂ مغرب میں' اقبالؒ کے سینے کو وقفِ اضطراب کر دیا اور اس سے دن کا چین اور رات کا آرام چھین لیا چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

یہی وہ دور تھا جس کے متعلق وہ بہت بعد میں کہا کرتے تھے کہ

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضورؐ کی لذت' کہاں حجابِ دلیل

اقبالؒ کی زندگی میں یہ مقام بڑا مشکل اور یہ دوراہہ بڑا فیصلہ کن تھا۔ اگر اس کش مکش میں دماغ' دل پر غالب آ جاتا۔ اگر مملکتِ عشق میں عقل کی حکمرانی ہو جاتی۔ اگر فلسفہ کی دلیلیں' ایمان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتیں۔ اگر زندگی کی سوداگرانہ مصلحت کوشیاں متاعِ فقر و قلندری کو خرید لیتیں تو اس کے بعد نہ صرف یہ کہ اقبال' اقبالؒ نہ ہوتا' بلکہ نہ دنیا کے نقشہ پر پاکستان کا وجود ہوتا اور نہ ہم آپ آج عشق و محبت کے ان جگر سوز افسانوں کو اس طرح دہراتے' نہ ملت اسلامیہ ہندیہ کا اپنا کوئی مستقر و مقام ہوتا اور نہ آج یہاں ایمان و قرآن کے انسانیت ساز تصورات کے چرچے ہوتے۔ اس نازک وقت میں خود اقبالؒ پر کیا گزر رہی تھی اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس پر کبھی یہ کیفیات خود وارد ہوئی ہوں۔ جب عقل و حکمت کی فسوں سازیاں' اس کے لئے فریب نگاہ بننے کی کوشش کرتیں تو عشق و مستی کی رندانہ جرأت فرمائیاں' عروسِ حقیقت کے حسین چہرے سے ذرا نقاب سرکا دیتیں۔ وہ حقیقت کی اس ایک چلمنی جھلک سے' فریبِ عقل سے جھنجھلا کر منہ موڑ لیتا اور اثر و درد میں ڈوبی ہوئی نوائے جگر گداز سے کہتا کہ

الٰہی عقلِ خجستہ پا کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری مجھے سرپیرہن نہیں ہے

اور کبھی بیتاب ہو کر دعائیں مانگتے کہ

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لا یحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

مبداء فطرت کا یہ انداز عجیب ہے کہ جب تلاشِ حقیقت کی تڑپ و خلش انتہائی شدت اختیار کر لیتی ہے تو حقیقت اپنے چہرے سے خود آپ نقاب اٹھا دیتی ہے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں نبی اکرمؐ سے فرمایا گیا کہ **ووجدک ضالاً فھدی**۔ ''ہم نے تجھے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو منزلِ حیات کی طرف راہنمائی کر دی۔'' چنانچہ جو شخص بھی تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہتا ہے فطرت کا غیر مرئی ہاتھ اس کی راہنمائی کر دیتا ہے۔ عام انسانوں کی صورت میں یہ راہنمائی سبل (یعنی پگڈنڈیوں) کی طرف ہوتی ہے۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبنا

(۲۹/۶۹)۔لیکن رسول کی راہنمائی صراط مستقیم، یعنی زندگی کی متوازن شاہراہ کی طرف ہوتی ہے۔ پگڈنڈیوں پر چلنے والے اگر اپنا رخ اس صراط مستقیم کی طرف کر لیں جس پر رسولؐ گامزن ہوتا ہے تو ان کی پگڈنڈیاں بھی اسی شاہراہ حیات سے مل جاتی ہیں۔ ورنہ ان کا کاروانِ حیات فضائے عقل وخرد کے پیچ وخم میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب تلاش حقیقت میں قلبِ اقبالؒ کی تپش وخلش بھی شدت تک پہنچ گئی تو اس فیصلہ کن لحہ میں مبداء فیض کی کرم گستری سے اس کا قدم صحیح راستہ کی طرف اٹھ گیا۔ جب عقل کی شرر انگیزیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر کر کہا کہ اس طلسم پیچ وتاب سے نکلنے کی راہ کون سی ہے تو وہ گھبرایا۔لیکن ایک ثانیہ میں اس کا دل پرسوز پکار اٹھا کہ

چارہ این است کہ از عشق کشادے طلبیم
پیشِ او سجدہ گذاریم و مرادے طلبیم

اس جواب سے اقبالؒ کا وہ قلبِ بیتاب جو اس کشمکش خرد و جنوں سے سراپا اضطراب بن رہا تھا۔ ایمان و یقین کی طمانیت بخش آسودگی سے قرار وسکون کی جنت بن گیا۔ یہی وہ لحہ تھا جس کی یاد میں وہ اس کیف ومستی سے پکار اٹھتا تھا کہ

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل و لے مجھے

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں
اہلِ گلشن پر گراں میری غزلخوانی نہیں
قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی
دل کے مٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی
ضَو سے اُس خورشید کی اختر میرا تابندہ ہے
چاندنی جس کے غبار راہ سے شرمندہ ہے
یک نظر کردی و آدابِ فنا آموختی
اے خنک روزے کہ خاشاکِ مرادرسوختی

اس سے اقبالؒ کے دل کو کس قدر یکسوئی نصیب ہوگئی اس کی خفیف سی جھلک اس نے اپنی اس نظم میں دکھائی ہے جو ''حسن وعشق'' کے عنوان سے بانگِ درا میں شامل ہے۔ مضمون کے علاوہ اس نظم میں حسنِ شعریت، تراکیب کی نُدرت، تشبیہات کی موزونیت، اور استعارات کی برجستگی دیکھئے اور پھر اندازہ لگائیے کہ ابتداء ہی سے فطرت نے اس حقائق شناس قلب کو اسلوب بیان بھی کس قدر حسین ودلکش عطا فرمایا تھا۔ (یہ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیانی دور کی نظموں میں سے ہے) کہتے ہیں۔

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیِ سیمینِ قمر
نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا آنچل لے کر
چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم
موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیلِ محبت میں یونہی دل میرا

ہے میرے باغِ سخن کے لئے تو بادِ بہار
میرے بیتاب تخیل کو دیا تو نے قرار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا میرے آئینے میں
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریک کمال
تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال
قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا

یہ عشق کی پہلی منزل تھی جس میں قرار وسکون ہی مدعائے حیات سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ منزل آئی جس میں شورش وحرارت مقصودِ کائنات نظر آتا ہے۔ عشق کی ان بلاانگیز شورشوں میں وہ لذت تھی کہ اقبالؒ اس حظ وکیف کے لئے قدم قدم پر **ھل من مزید** کی دعائیں کرتا اور عجیب رقص ومستی میں پکار اٹھتا تھا کہ

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو، یا مجھے آشکار کر

جب اقبالؒ کو اس کشمکشِ پیہم سے اس طرح فراغ نصیب ہو گیا تو اس نے عقل وخرد کے اس تمام دفترِ بے معنی پر، جو اپنے آپ کو وجہِ قیامِ کائنات سمجھے ہوئے تھا، ایک تبسم ریز نگاہ ڈالی اور اس سے اپنے مخصوص انداز میں کہہ دیا کہ

تیری متاع حیات، علم و ہنر کا سرور
میری متاعِ حیات، ایک دلِ ناصبور

فلسفہ نے یہ سنا تو اقبالؒ سے پوچھا کہ ذرا یہ تو بتائیے کہ اس آشفتہ سامانی اور چاک گریبانی کی منطقی توجیہ کیا ہے؟ اقبالؒ نے ہنس کر کہا کہ

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

جاتے جاتے طبعیات کی جھاڑیوں نے اس کا دامن الجھایا اور کہا کہ ذرا ٹھہریئے کہ آپ کو آغازِ حیات کا راز بتاؤں۔ اقبالؒ نے سنا اور قلندرانہ استغناء کی شان سے جواب دیا کہ

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

فلکیات نے کہا کہ میری رصدگاہوں سے فضائے آسمانی کی محیر العقول پہنائیوں اور ان میں تیرنے والے تحیر انگیز کروں کا تماشا نظر آئے گا۔ اس مردِ دانا نے سنا اور ایک خندۂ زیر لبی سے جواب دیا کہ اب یہ لاانتہا وسعتیں میرے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو لامکاں سمجھا تھا میں

☆☆☆☆☆

اقبالؒ کے سامنے جب مقصودِ حیات اس طرح واضح ہو گیا تو اس نے اپنے لئے مستقبل کا راستہ متعین کر لیا۔ اس کے سامنے عشق کے اس زندگی بخش پیغام کو تمام دنیا کے انسانوں میں عام کرنا تھا۔ یاد رکھئے۔ جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ عشق سے اقبالؒ کی مراد وہ نظام ربوبیت تھا جو وحی کی

بنیادوں پر استوار ہوتا تھا اور جس کا مقصود نوعِ انسانی کی فطری صلاحیتوں کا کامل نشوو ارتقا تھا۔ یہ نظام تمام انسانیت کے لئے تھا لیکن اس کی ابتداء کسی ایسے خطۂ زمین اور ایسے گروہ سے کی جا سکتی تھی جو اس پیغام کی عملی تشکیل کے لئے اولین خمیر بن سکے۔ اس نے جب اپنی قوم پر نگاہ ڈالی تو اسے یکسر راکھ کا ڈھیر پایا۔ بایں ہمہ اسے اس راکھ کے ڈھیر کے نیچے سلگتی ہوئی چنگاریاں بھی دکھائی دیں۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی آتش نوائی سے اس راکھ کے ڈھیر کو شعلۂ جوالہ بنا کر اس سے نوعِ انسانی کے لئے زندگی کی حرارت کا کام لے گا چنانچہ اس نے یورپ ہی سے اپنے رفقاء کو اپنے اس پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ عبدالقادر مرحوم کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانند سپند اپنی بساط
اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں
اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

بلکہ اس سے بھی زیادہ واضح اور متعین انداز سے کہ

گئے وہ ایام اب زمانہ نہیں ہے صحرا نوردیوں کا
جہاں میں مانندِ شمعِ سوزاں، میانِ محفل گداز ہو جا

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہِ حجاز ہو جا

ان آرزوؤں اور دعاؤں، ان ولولوں اور تمناؤں کو دل میں لے کر اقبالؒ ہندوستان واپس آیا۔ گیا تو ایک مجموعۂ اضداد تھا۔ واپس آیا تو ہمہ تن یک رنگ و یک آہنگ۔ گیا تو دل میں شکوک وشبہات کی ہزاروں پھانسیں لئے ہوئے۔ آیا تو اسے سکون وطمانیت کی جنت بنائے ہوئے۔ گیا تھا فلسفی بننے کے لئے۔ آیا نوعِ انسانی کے لئے پیامبر بن کر۔ گیا تھا سازِ عقل لے کر، آیا سوزِ عشق خرید کر اور اس متاعِ سوز و ساز اور سرمایۂ تپش و گداز کو لے کر آیا۔ اس برف آلود سرزمینِ مغرب سے جہاں عشق وایمان کی رہی سہی چنگاریاں بھی بجھ جایا کرتی ہیں۔ گیا تھا تو وہ انداز تھا اور واپس آیا تو اس شان سے کہ کیف ومستی کی فضاؤں میں جھوم رہا ہے اور وجد ورقص کے عالم میں گنگنا رہا ہے کہ

کافر ہندی ہوں میں، دیکھ میرا ذوق وشوق
دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود
شوق میری لے میں ہے، شوق میری نے میں ہے
نغمہ اللہ ہو، میرے رگ و پے میں ہے

لیکن عشق وجنون کی ان وادیوں میں پہنچ کر اقبالؒ نے عقل کو تیاگ نہیں دیا۔ اس لئے کہ عقل وخرد کو تیاگ دینا، قرآن کا

پیغام نہیں رہبانیت کا مسلک ہے۔ قرآن کی رو سے عقل اور وحی کا تعلق ایسا ہی ہے جیسے انسان کی آنکھ اور روشنی کا تعلق ہے جو اپنی آنکھ سے کام نہیں لیتا اس کے لئے روشنی کا عدم و وجود برابر ہے اور آنکھ بغیر روشنی کے بیکار ہے۔ لہٰذا قرآن کا پیغام عقل کو وحی کے تابع رکھنا اور ان دونوں کے امتزاج سے ایک نئی دنیا کی تعمیر کرنا ہے۔ چنانچہ عقل و عشق، خرد و جنوں، ذکر و فکر، خبر و نظر، علم و حضور کے اس حسین امتزاج کا نام تھا۔ اقبالؒ جس نے کہا کہ

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

اور مشرق و مغرب دونوں کو یہ پیغام دیا کہ

غربیاں را زیرکی ساز حیات
شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس
کار عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چو با زیرکی ہمبر شود
نقشبدِ عالمِ دیگر شود
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ
عشق را بازیرکی آمیز دہ

مغرب نے تنہا عقل کی ابلہ فریبیوں سے ساری دنیا کو قمار خانہ بنا رکھا تھا۔ مشرق میں ملّا اور صوفی کی کم نگہی نے اسلام جیسے انقلاب در آغوش نظامِ حیات کو بے نتیجہ رسوم کا مجموعہ اور محکومی و ناامیدی کے مسلک گوسفندی کا نقیب قرار دے رکھا تھا۔ اقبالؒ کے پیشِ نظر مغرب اور مشرق کے ان دونوں تصوراتِ زندگی کے خلاف جنگ کرنا تھا۔ چونکہ فطرت نے اقبالؒ سے یہ بہت بڑا کام لینا تھا اس لئے اسے اس مقصدِ عظیم کے لئے خاص طور پر تیار کیا گیا۔ ''فرشتوں کے نام خدا کے پیغام'' میں ہے کہ

تہذیب نوی کارگہِ فتنہ گری ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

اور انہی آدابِ جنوں کا اثر تھا کہ اس نے تہذیبِ حاضر کے اس نگاہ فریب طلسم کو توڑ کر رکھ دیا

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی
مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیٔ خارا

لیکن تہذیبِ نو کے اس سیلاب سے کہیں زیادہ ہلاکت انگیز خود اپنے ہاں کے مکتب و خانقاہیت کی تعلیم تھی جس کے خلاف اقبالؒ کو مسلسل جہاد کرنا تھا۔ اس کے لئے اس نے متلاشیانِ حقیقت کو پکار کر کہا کہ

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

وہ ان سے بار بار کہتا کہ

رہ و رسمِ حرم نامحرمانہ
کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے مرا پیراہنِ چاک
نہیں اہلِ جنوں کا یہ زمانہ

اس نے دیکھا کہ مدعیانِ علمِ شریعت انسانی زندگی کے ابتدائی مسائل تک سے ناواقف ہیں اس لئے ان کے لئے قطعاً ناممکن ہے کہ وہ مقامِ کبریا کو پہچان سکیں۔ اس نے ملّا سے برملا کہا کہ

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

جب ارباب شریعت وطریقت کی سطح بیں نگاہیں اس کے حقیقت رس پیغام پر تنقید کرتیں تو وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا اور بے نیازانہ کہہ دیتا کہ یہ بیچارے معذور ہیں اس لئے معاف کر دینے کے قابل۔ یہ نہیں جانتے کہ میں کیا کہتا ہوں اور کس مقام سے کہتا ہوں

کیا صوفی و ملّا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

لیکن جاننے والی نگاہیں جانتی تھیں کہ یہ دانندۂ اسرار حقیقت کیا کہتا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے اور اعتراف کرتے کہ

رازِ حرم سے شاید اقبال باخبر ہے
ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ

وہ جانتا تھا کہ ہماری مروجہ شریعت اور طریقت دونوں کے مستعار تصورات اسلام کے عجمی ایڈیشن ہیں جن پر صرف ڈسٹ کور (Dust-Cover) قرآن کا ہے۔ اسے خوب معلوم تھا کہ یہ عجمی نظریاتِ زندگی فکر اسلامی کے شجر طیب پر اکاس بیل کی طرح مسلط ہیں۔ جب تک اس اکاس بیل کو الگ نہیں کیا جائے گا۔ شجرِ ملت کبھی شگفتہ وشاداب نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے وہ پوچھنے والوں سے کہتا کہ

کئے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے
کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

ظاہر ہے کہ ایسے انقلاب آفریں پیغام کی ہر طرف سے مخالفت ہونی تھی۔ لیکن اس نے اس مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی آتش نوائی کو مسلسل جاری رکھا اور اس طرح رفتہ رفتہ فضائے ملت اس کی آہِ نیم شبی اور نالۂ سحری سے اثر پذیر ہوتی چلی گئی۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر اس نے کہا تھا کہ

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی
دیا ہے میں نے انہیں ذوق آتش آشامی

لیکن اس کے باوجود اس کی قوم جس خواب گراں میں سو رہی تھی اسے اس سے جگانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ ہزار برس سے گاڑی زندگی کی صراطِ مستقیم چھوڑ کر دوسری پٹڑی پر چلی جا رہی تھی۔ اسے اس مقام سے واپس لا کر پھر سے صحیح لائن پر ڈالنا' آفتابِ مغرب کی طنابیں کھینچ کر اسے سوئے مشرق لانا تھا۔ اسے خدا سے شکایت ہی یہ تھی۔

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہانخانۂ لاہوت سے پیوند

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
تاثیر یہ ہے میرے نفس کی کہ خزاں میں
مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

واضح رہے کہ اقبالؒ کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ نہیں تھا کہ انگریزوں کی بجائے حکومت ہمارے اپنے ہاتھ میں آ جائے۔ بلکہ یہ کہ اس خطۂ زمین کے مسلمان' انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی بجائے' ضابطۂ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر سکیں' اسی مقصد کے لئے اس نے ملت اسلامیہ کو پاکستان کا تصور دیا تھا۔ لیکن قوم نے اس وقت اس تصور کو ایک شاعر کا افسانوی تخیل سمجھ کر اس پر غور و فکر کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ ایک طرف اپنی قوم کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف مخالف قوتیں برق رفتاری کے ساتھ چاروں طرف سے ہجوم کر کے امنڈے چلی آ رہی تھیں۔ حالات ایسے نامساعد تھے لیکن بایں ہمہ' وہ اس سیلاب بلا انگیز میں روشنی کے مینار کی طرح کھڑا تھا کہ زمانہ کی تلاطم انگیز موجیں آئیں اور اپنا سر پھوڑ کر واپس چلی جائیں۔ یہی تھے وہ حالات جن کے متعلق اس نے کہا تھا کہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

ان ناموافق حالات میں ہمرہانِ سست عناصر اسے مایوسیوں کے چھلاوے سے ڈراتے اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے کہ

ہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے
سینۂ سوزاں ترا فریاد سے معمور ہے
قصۂ گل ہم نوایانِ چمن سنتے نہیں
اہلِ محفل تیرا پیغامِ کہن سنتے نہیں
زندہ پھر وہ محفلِ دیرینہ ہو سکتی نہیں
شمع سے روشن شبِ دوشینہ ہو سکتی نہیں

تو اس کا چہرہ تمتما اٹھتا' پیشانی جوشِ حمیت سے شفق آلود ہو جاتی۔ وہ امیدوں کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے اٹھتا اور حزم و یقین کی پوری قوتوں سے کہتا کہ

ہم نشیں! مسلم ہوں میں' توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں میں
نبضِ موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے
اور مسلم کے تخیل میں جسارت اس سے ہے
حق نے عالم اس صداقت کے لئے پیدا کیا
اور مجھے اس کی حفاظت کے لئے پیدا کیا
میری ہستی' پیرہن عریانیٔ عالم کی ہے
میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
ہاں یہ سچ ہے' چشم برعہد کہن رہتا ہوں میں
اہلِ محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں

یادِ عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

وہ جانتا تھا کہ ناامیدیوں کے چھلاوے سے ڈرانے والے وہ ہیں کہ مدت ہائے دراز سے تقلید اور بے عملی کے حیات سوز اثرات ان کی ہڈیوں کے گودے تک میں سرایت کر چکے ہیں اور وہ اپنی زندگی میں خفیف سی تبدیلی کے تصور تک سے گھبرا اٹھتے ہیں۔ وہ ان پیرانِ کہن سے کوئی توقع نہیں رکھتا تھا' اس لئے وہ اپنے پیغام کا حقیقی مخاطب ان نوجوانوں کو سمجھتا تھا جن کے قلب ونگاہ کی تبدیلی' قوموں کی تقدیریں بدل دیا کرتی ہے۔ انہی کو وہ اپنی متاع سوز وگداز کا وارث سمجھتا اور انہی کے لئے راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں مانگا کرتا تھا کہ:

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا
خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری' آرزوئیں مری
امیدیں مری جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

ملت کے مستقبل کا یہی غمِ پنہاں تھا جس نے اقبالؒ پر راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ علی بخش کا بیان ہے کہ جن دنوں آپ کی طبیعت زیادہ خراب تھی' ایک رات' پچھلے پہر' میں نے سنا کہ پلنگ سے سسکیوں کی آواز آ رہی ہے۔ چپکے سے قریب گیا تو دیکھا کہ آپ تکیہ پر کہنیاں ٹیکے دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے ہیں اور زار وقطار رو رہے ہیں۔ رو رہے اور گنگنا رہے ہیں کہ

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو! کہ پھر شاید کوئی مشکل مقام آیا

اس غزل کے دو شعر اور بھی سنئے۔ فرماتے ہیں۔

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی
کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغِ بے نیام آیا

چل اے میری غریبی کا تماشا دیکھنے والے
وہ محفل اُٹھ گئی جسدم کہ مجھ تک دور جام آیا

علی الصباح حسب معمول حکیم صاحب آئے۔ دیکھا تو رنگ معمول سے زیادہ زرد ہے اور چہرہ پہلے سے زیادہ افسردہ۔ آنکھیں سوج رہی ہیں اور کمزوری بڑھ گئی ہے۔ کیفیت مزاج کا پوچھا تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور بمشکل اتنا کہہ سکے کہ

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات تازہ ہیں میرے واردات

حکیم صاحب نے ہلکے سے تبسم سے کہا کہ آپ تو دنیا بھر کے مسائل کا حل دوسروں کو بتاتے رہتے ہیں۔ اپنی مشکل کا حل کیوں نہیں تلاش کر پاتے! انہوں نے بھی اسی انداز کے تبسم زیرلبی سے فرمایا کہ کیا کہوں!

مقام ہوش سے آساں گذر گیا اقبال
مقام شوق میں کھویا گیا یہ دیوانہ

حکیم صاحب نے پوچھا کہ بالآخر وہ کونسی بات ہے جس کا غم آپ کو اس طرح نڈھال کئے جا رہا ہے۔ کہا کہ حکیم صاحب! آپ دیکھتے نہیں کہ

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ میکدہ، کم طلب و تہی کدو
میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت، کھوئے ہوؤں کی جستجو

حکیم صاحب نے کہا کہ آپ کا مرض زیادہ تشویش انگیز ہوتا جا رہا ہے۔ آپ کو، کچھ دنوں کے لئے ان تفکرات کو چھوڑنا ہوگا۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب! میں جانتا ہوں کہ

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے
لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ
اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

اتنے میں ڈاک آ گئی۔ دیکھا تو اس میں ایک خط ایک ایسے فلسفہ زدہ نوجوان کا تھا جس کے والد سے آپ کے دیرینہ مراسم تھے۔ اسنے جیسا کہ فلسفہ کے ابتدائی مراحل میں اکثر ہوتا ہے جب کہ طالب علم کے افکار میں ہنوز پختگی نہیں آتی، نفسِ انسانی، وحی، حیات بعد الممات، مستقل اقدار وغیرہ تصورات پر نہایت طنز آمیز اعتراضات کئے تھے۔ آپ نے خط پڑھ کر پنسل اٹھائی اور اسی کی پشت پر لکھ دیا کہ

میں اصل کا خاص سومناتی
آباء مرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد
میری کفِ خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میرے آب و گل میں
پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبال اگرچہ بے ہنر ہے
اس کی رگ رگ سے باخبر ہے

شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز
سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت
ہیں ذوقِ طلب کے واسطے موت
دِیں مسلکِ زندگی کی تقویم
دِیں سِر محمدؐ و براہیم
دل در سخنِ محمدیؐ بند
اے پُورِ علیؓ ' زبو علی چند

ابھی اس خط کا جواب ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ لاہور کے ایک مشہور روزنامہ کے مدیر جن کا شمار آپ کے حلقۂ ارادتمندان میں ہوتا تھا' اندر آ گئے۔ خیریت مزاج کے بعد کہا کہ آپ نے دیکھا ہے کہ آپ کے حالیہ بیان پر فلاں اخبار کے ایڈیٹر نے کیسے رکیک حملے کئے ہیں۔ آپ مسکرائے اور کہا کہ میں نے دیکھا تو نہیں۔ کل شام فلاں صاحب سے سنا ضرور تھا۔ انہوں نے جھجکتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ کوئی جواب لکھیں گے۔ آپ نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا' کہ بھائی! میں ان جھمیلوں میں کبھی نہیں الجھتا؟ آپ مجھے جانتے ہیں کہ

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں' نہیں دانۂ اسپند
پرسوز و نظر باز ونکوبین و کم آزار!
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند
ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکرخند

حتیٰ کہ میرا تو یہ عالم ہے کہ

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

مدیر صاحب نے کہا کہ درحقیقت یہ ایک سازش ہے دو قوموں کے اس نظریہ کے خلاف جس کا تصور آپ نے پیش کیا ہے اور جس کی رُو سے مسلمانانِ ہند کو اپنے مستقبل کے لئے ایک واضح اور درخشاں نصب العین مل گیا ہے۔ آپ نے پھر مسکرا کر فرمایا کہ سازش ہے تو ہوا کرے مجھے اس کی کیا پرواہ ہے۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں ابتک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

بعد سہ پہر' حسب معمول' پھر ملنے والوں کا اجتماع ہوا۔ دنیا بھر کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک صاحب نے کہا کہ (مولانا) حسین احمد مدنی نے آپ کے اشعار کے جواب

میں جو بیان دیا ہے وہ آپ کی نظروں سے گذرا! فرمایا کہ ہاں میں نے دیکھا ہے۔ اسنے کہا کہ مولوی صاحب نے قوم اور ملت کے متعلق جو لفظی بحث چھیڑی ہے آپ اس کا کچھ جواب دیں گے؟ فرمایا کہ

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا
حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

پھر حقہ کا کش لگایا اور مسکراتے ہوئے فرمایا

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

آپ کے حلقہ احباب میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہیں ہمیشہ اس بات کا قلق رہتا کہ نالائق اور جاہل لوگ بڑے بڑے مناصب و مدارج حاصل کئے جاتے ہیں اور آپ ہیں کہ جن کی قابلیت کا سکہ ساری دنیا مان رہی ہے لیکن اس طرح ایک گوشے میں پڑے ہیں۔ وہ آتے اور آپ سے کہتے کہ فلاں اسامی خالی ہو رہی ہے۔ آپ اپنی آمادگی ظاہر کر دیجئے' فوراً کامیابی ہو جائے گی۔ آپ ان مخلص بہی خواہوں کی سادگی پر مسکراتے اور جی ہی جی میں کہتے کہ میں انہیں کس طرح بتاؤں کہ مبداء فیض کی عنایاتِ خسروانہ نے مجھے کیا عطا کیا ہے اور یہ مجھے کس طرف بلا رہے ہیں۔ وہ زیادہ اصرار کرتے تو آپ ان سے کہتے کہ

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک
رکھتی ہے مگر طاقتِ پرواز مری خاک
وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقلِ ادراک
وہ خاک کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک
وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی
چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک
اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جس کی ستاروں کو عرق ناک

جاوید سے آپ کو بہت محبت تھی۔ وہ ابھی بچہ ہی تھا لیکن اس سے آپ بڑے کام کی باتیں کرتے تھے۔ ایک دن اس نے پوچھا کہ ابا جان آپ کے پاس نہ اچھے اچھے کپڑے ہیں' نہ قیمتی صوفے اور قالین ہیں۔ نہ بہت سے نوکر چاکر ہیں' نہ موٹر ہی ہے۔ لیکن آپ کے پاس بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ یہ آپ کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں؟ آپ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ بیٹا!

ہے میری بساط کیا جہاں میں
بس ایک فغانِ زیر بامی
اک صدقِ مقال ہے کہ جس سے
میں چشم جہاں میں ہوں گرامی

جب آپ لندن گئے ہیں تو جاوید نے پہلا خط اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجا۔ اس کے جواب میں آپ نے اسے لکھا کہ

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

☆☆☆

زمانہ آگے بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ہی اقبالؒ کے پیغام کی تندی اور تیزی بھی شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ اس کی نگہ بصیرت دیکھ رہی تھی کہ دنیا میں کیا ہونے والا ہے اور اس کی بساطِ سیاست پر مسلمان کس طرح پٹ رہا ہے۔ اس آنے والے انقلاب کے تصور سے جوں جوں اس کا احساس شدید ہوتا جاتا اس کی نوا کی تلخی بھی تیز ہوتی جاتی۔ اقبالؒ کے پیشِ نظر پوری انسانیت کے اندر ایک ایسا انقلاب برپا کرنا تھا جس سے یہ زمین بدل جائے' یہ آسمان بدل جائے اور خاکِ آدم کو وہ نمود حاصل ہو جس کے لئے اسے اس طرح سنوارا گیا تھا۔ انقلاب آفرینی کا یہی وہ جذبہ تھا جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے پیدا
ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

دوسرے مقام پر کہتے ہیں کہ

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی
گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی
خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی
رومی ہے نہ شامی ہے کاشی نہ سمرقندی
سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے
آدم کو سکھاتا ہے' آدابِ خداوندی

اُدھر آسمان پر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں لیکن ادھر زمین والے ہنوز یہی طے نہیں کر پائے تھے کہ اقبالؒ جو کچھ کہتا ہے اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ کوئی کہتا کہ اس کے کلام میں سوز و گداز اور کیف و مستی کے تذکرے ان نقوش کے اثرات کا نتیجہ ہیں جو بچپن کی مشرقی تعلیم اور تصوف آمیز ماحول نے اس کے تحت الشعور میں مرتسم کر رکھے ہیں۔ کوئی کہتا کہ اسکی فکر' نیٹشے' برگسان' الیگزینڈر' وارڈ' چیمز' جیسے مغربی مفکرین کے فلسفہ کی رہین منت ہے۔ اقبالؒ یہ سب کچھ سنتا اور ان سادہ لوح معترضین سے کہتا کہ جب تم اس منبع علم و یقین سے آشنا نہیں ہو جو میری فکر کا سرچشمہ ہے تو اس باب میں قیاس آرائیاں کیوں کرتے ہو؟ میری فکر نہ مشرقی مکتب و خانقاہ سے متاثر ہے نہ مغربی حکمت و فلسفہ کی منت پذیر۔

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض میری
یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

میں نے مشرق و مغرب دونوں کے علوم و فنون کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان میں مجھے حقیقت کا کہیں سراغ نہیں ملا۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہی صہبا

میری فکر کسی سے بھی متاثر نہیں۔ میں نے کسی چیز کو تقلیداً دیکھا ہی نہیں بلکہ ہر شے کو از خود پرکھا ہے اور اپنے نتائج آپ مستنبط کئے ہیں۔

میانِ آب و گل خلوت گزینم
ز افلاطون و فارابی بریدم
نگردم از کسے دریوزۂ چشم
جہاں را جز بہ چشمِ خود نہ دیدم

یہی میرا مسلک ہے جس سے اب کیفیت یہ پیدا ہو چکی ہے کہ لاکھ پردوں میں چھپی ہوئی حقیقت' میری نگہِ تجسس کے سامنے از خود بے نقاب ہو جاتی ہے۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ

اقبال نے کل اہلِ خیاباں کو سنایا
یہ شعر نشاط آور و پرسوز و طربناک
میں صورتِ گل دست صبا کا نہیں محتاج
کرتا ہے میرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

یہی وہ حقیقت کشائی ہے جس سے میری دیدہ وری کا یہ عالم ہے کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

چنانچہ وہ جہانِ فردا جس کے انتظار میں آسمان کے تاروں کی آنکھیں ایک مدت سے محرومِ خواب ہیں' میرا پیام اس کے لئے طائر پیش رس ہے'

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نواؤں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

لہٰذا اس عالمِ ہست و بود کی حقیقت صرف اس پر کھل سکتی ہے جس کی سمجھ میں میرا پیغام آ جائے۔

نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا
جسے آ گئی میسر مری شوخیٔ نظارا

لوگ سمجھتے ہیں کہ اقبال' جاوید منزل میں پلنگ پر لیٹے لیٹے حقہ پیتا رہتا ہے اور شاعری کرتا رہتا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے
انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

یہ شاعری نہیں ہے۔ نہ ہی شاعری کسی پیغام بر کے شایانِ شان ہوتی ہے۔ جس کے سامنے زندگی کا نصب العین متعین ہو' اس کا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھ رہا ہو' اور اس لئے وہ ہر مخاطب کو اسی منزل کی طرف لے جا رہا ہو' اسے شاعری سے کیا واسطہ!

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

یہ وہی ''رازِ درونِ میخانہ'' تھے جن کے متعلق میں نے زبورِ عجم میں کہا ہے کہ

زِبرونِ در گذشتم' ز درونِ خانہ گویم
سخنے نگفتۂ را چہ قلندرانہ گفتم

تم اسے شاعری سمجھتے ہو اور میں شاعری کو اپنے خلاف تہمت خیال کرتا ہوں۔

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم
مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست
کہ برما تہمتِ شعر و سخن بست

تم اسے حسن و شباب کے رنگین افسانے سمجھتے ہو؟ تم اسے عہد کہن کی خواب آور داستانیں تصور کرتے ہو؟ تم یہی سمجھے بیٹھے ہو کہ یہ گُل و مُل کی فرضی کہانیاں ہیں؟ تمہارا اندازہ یہی ہے کہ یہ ایک شاعر کی دنیائے تصورات کی پریشاں خیالیاں ہیں؟ اگر تمہارا یہی اندازہ ہے تو کس قدر غلط ہے' تمہارا یہ اندازہ؟ اگر تمہارا یہی خیال ہے تو کس قدر باطل ہے تمہارا یہ خیال! اگر تم جاننا چاہتے ہو کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ درحقیقت ہے کیا' تم آؤ! میرے مئے سخن کے پیالے میں جھانک کر دیکھو اس میں کیا نظر آتا ہے؟

دو عالم را تواں دیدن بہ مینائے کہ من دارم
کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم
اگر دیوانۂ آید کہ در شہر افگند ہُوئے
دو صد ہنگامہ بر خیزد ز سودائے کہ من دارم
مخور ناداں غم از تاریکیٔ شبہا کہ می آید
کہ چوں انجم درخشد داغِ سیمائے کہ من دارم
ندیمِ خویش می سازی مرا' لیکن ازاں ترسم
نداری تابِ آں آشوبِ غوغائے کہ من دارم

سننے والے یہ سب کچھ سنتے لیکن ان کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آتا تھا کہ اگر یہ خیالات نہ فکرِ مغرب سے مستعار لئے ہیں نہ تصوراتِ مشرق سے' نہ یہ مکتب کی زلہ چینی ہے نہ خانقاہ کی دریوزہ گری۔ نہ یہ شاعری ہے نہ افسانہ طرازی۔ تو پھر بالآخر ان تصوراتِ حیات کا سرچشمہ کیا ہے؟ وہ مردِ خود آگاہ و خدا مست یہ کچھ سنتا اور کہتا کہ آؤ! تمہیں بتاؤں کہ میرے انقلاب بردوش پیغام کا سرچشمہ کیا ہے۔ اس کا سرچشمہ ہے۔

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

میں نے عمر بھر اسی شمع عالم تاب سے اکتسابِ ضیاء کیا ہے۔ اسی یمِ ناپیدا کنار سے حکمت کے موتی نکالے ہیں۔

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام
شرح رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام

اس لئے

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر
بعد ازیں ناید چومن مردِ فقیر

لیکن سننے والے کہتے کہ اس قرآن کو تو ہم ہر روز پڑھتے ہیں۔ اس کی تفسیریں بھی دیکھتے ہیں۔ ہمیں تو اس میں یہ کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ دانائے راز' ان سادہ لوحوں کی یہ باتیں سنتا اور کہتا کہ قرآن اپنے آپ کو اس طرح بے نقاب نہیں کیا کرتا۔ اس کے سمجھنے کے انداز کچھ اور ہی ہیں۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

اس لئے

چو مسلماناں اگر داری جگر
در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر

برادران! یہ ہے وہ اقبالؒ جس نے کہا تھا کہ

چو رختِ خویش بربستم ازیں خاک
ہمہ گفتند باما آشنا بود
و لیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

میں نے بھی اسی اقبالؒ کی تلاش میں ساری عمر گذار دی۔ اسے مختلف وادیوں اور متنوع شاہراہوں میں ڈھونڈتا رہا۔ لیکن آخرالامر قرآن ہی سے اس کی راہ اور منزل کا سراغ پایا۔

اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت کے بعد آخر یہ شاہیں زیر دام آیا

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزمِ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	160/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	325/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	325/-
سورہ النحل	(16)	334	250/-	سورہ یٰسین	(36)	164	125/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	275/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	325/-
سورۃ الکہف و سورہ مریم	(18-19)	532	325/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	325/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	275/-				
سورۃ الانبیآء	(21)	336	225/-				
سورۃ الحج	(22)	380	275/-				
سورۃ المؤمنون	(23)	408	300/-				
سورۃ النور	(24)	264	200/-				
سورۃ الفرقان	(25)	389	275/-				
سورۃ الشعرآء	(26)	454	325/-				
سورۃ النمل	(27)	280	225/-				
سورہ القصص	(28)	334	250/-				
سورہ عنکبوت	(29)	388	275/-				

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) 25/B، گلبرگ 2، لاہور، فون نمبر: 4546 3571-42-92+

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایم۔ایس۔ناز

غلام احمد پرویز سے علامہ اقبالؒ کے متعلق خصوصی انٹرویو

س۔ علامہ اقبال سے آپ کی پہلی اور آخری ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟ صحبتیں جو گزر گئیں' ان کی یاد تازہ کیجئے۔

ج۔ پہلی ملاقات کے متعلق تو متعین طور پر نہیں کہہ سکتا کہ کب اور کہاں ہوئی؟ اس لئے کہ وہ تو پچاس سال سے بھی زائد کا عرصہ ہے' آخری ملاقات البتہ ان سے جنوری ۱۹۳۸ء میں ہوئی' جب یوم اقبال' کی تقریب کے سلسلے میں دہلی سے ہمارا قافلہ لاہور آیا اور ان سے ان کی قیام گاہ پر ملاقات ہوئی۔اس زمانہ میں یوں کہئے کہ وہ گویا بستر مرگ پر ہی تھے۔ بینائی بھی بہت کمزور تھی' بولنے میں ان کو بڑی تکلیف ہو رہی تھی' لیکن اس کے باوجود انہوں نے خاصا وقت ہمیں دیا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ کچھ میری رعایت برتی' اس لئے کہ ہمارے صاحب کارواں علامہ اسلم جیراجپوری علیہ الرحمہ تھے' ان کے اکرام واحسان کی بدولت ہمیں بھی یہ سعادت نصیب ہوگئی۔ خاصا وقت اس میں صرف ہوا اور یہ آخری ملاقات ہے جو حضرت علامہ علیہ الرحمہ سے ہوئی۔ باقی رہے تاثرات' تو محترم سید نذیر نیازی صاحب نے اپنی کتاب ''اقبال کے حضور میں'' اس دن کی صحبت کا تفصیلی نقشہ پیش کیا ہے۔اس سے معلوم ہو جائے گا کہ ہم ان سے کس قسم کے سوال.....؟

سوال تو میں نہیں کہہ سکتا' میری حیثیت تو ان کے سامنے ایک ادنیٰ سے متعلم کی رہی' ہم تو استفادہ ہی کرتے تھے' جرأت کر لیتے تھے کچھ پوچھنے کی' اگرچہ وہ بہت جرأت دلایا کرتے تھے' حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے' ان کا تو انداز ہی ایسا تھا' وہ کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کوئی بڑی شخصیت ہیں اور ان کے سامنے کچھ چھوٹے لوگ بیٹھے ہیں' وہ تو سب کو برابر کی حیثیت دیتے تھے اور بعض اوقات تو انکسار اور بھی بڑھ جاتا تھا' جو ہم لوگوں کے لئے حوصلہ افزا ثابت ہوتا تھا۔

س۔ پرویز صاحب! اقبال کے حضور میں اس وقت کوئی ایسا موضوع بھی زیر بحث آیا ہو' جس کا ذکر نذیر نیازی صاحب نے اپنی کتاب میں نہ کیا ہو؟

ج۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ سوال اس میں آ گیا ہے یا نہیں' لیکن دو باتیں بڑی اہم ہیں' حضرت علامہ نے 'جاوید نامہ' میں مختلف ارواح یا مختلف ہستیوں سے عالم بالا میں ملاقات کی جو روئداد بیان کی ہے' میرے نزدیک حضرت

سید احمد شہید علیہ الرحمہ اور ان کا معرکہ بالاکوٹ' ہمارے اس آخری دور کی اسلامی تاریخ میں بڑا پر عظمت ہے' سو میں نے اس موقعہ پر حضرت علامہ سے عرض کیا کہ جی چاہتا تھا کہ آپ سرسید اور سید احمد شہید' دونوں کی ارواح کو آمنے سامنے لا کر ذرا اس کا تقابل بتاتے۔ اس پر حضرت علامہ نے فرمایا ''یہ اور اس قسم کے اور کئی سوال تھے جو بعد میں میرے ذہن میں آئے اور ایسا ہو جاتا ہے' اب جب بھی مجھے فرصت ملی میں ان چیزوں کو ضرور سامنے لاؤں گا''۔

اور ایک سوال' میں نے یہ عرض کیا کہ یہ جو قیامت کا واقعہ یا حقیقت ہے وہ ہمارے ذہن میں تو ہے کہ ہم انسان ایک دن اللہ رب العزت کے حضور پیش ہوں گے' لیکن قرآن میں تو ہے کہ تیرا خدا اور اس کے ملائکہ یہاں آئیں گے تو کیا یہ سارا ماجرا یہاں ہی ہوگا؟

انہوں نے کہا کہ حیات بعد ممات اور وہاں کے جتنے بھی نظریات ہیں' ان سب کے متعلق میرے ذہن میں ہے اور میں قرآن کریم کی تفسیر کی (introduction) میں اس سوال کو موضوع سخن بناؤں گا۔

س۔ حضرت علامہ کی صحبت میں جو ان کے شیدائی بیٹھتے تھے' وہ کس قسم کے سوال کرتے تھے؟

ج۔ (مسکراتے ہوئے) یہ شیدائیوں کی بھی مختلف نوعیتیں اور قسمیں ہیں' آپ کا استفسار ہے کہ ان کے ہاں کس قسم کے لوگ بیٹھتے تھے؟ ان کی کیفیت تو بڑی دلچسپ ہے۔ حضرت علامہ چونکہ ڈاکٹر مشہور تھے۔ تو ایک دفعہ ایک شخص نے آ کر سوال کیا کہ میرے پیٹ کا درد بڑا پرانا ہے' کسی حکیم یا ڈاکٹر سے فائدہ نہیں ہوا' آپ مجھے کوئی اچھا سا نسخہ لکھ دیجئے۔

(قہقہہ لگاتے ہوئے) تو صاحب حضرت علامہ تو یہ بھی بتا دیا کرتے تھے۔ اسی طرح مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ موچی دروازے کا ایک جفت ساز ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: ہمارا کاروبار پہلے خوب چلتا تھا' مگر جب سے انگریزی جوتے مارکیٹ میں آ گئے ہیں' ہمارا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے' کسی نے ہمیں بتایا کہ علامہ صاحب بڑے اچھے مشورے دیتے ہیں' سو میں آپ سے مشورہ لینے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

غرض کہ یہاں سے لے کر یورپ کے بڑے بڑے بلند پایہ مفکروں تک حضرت علامہ کی مجلس میں آیا کرتے تھے۔ ہر کوئی اپنی اپنی ذہنی سطح' افتاد طبیعت اور مزاج کے مطابق سوال کرتا تھا اور اس کو اس کے مطابق ہی جواب ملتا تھا۔ ادیب' شعراء' فلاسفر اور خود مولوی صاحبان (مسکراتے ہوئے) پیر پرست لوگ بھی۔ کئی ایسے بھی تھے جو آ کر کہا کرتے تھے کہ حضرت کسی طرح سے آپ ڈاڑھی رکھ لیں' تو پھر دیکھیں کہ دنیا کیسے آپ کی گرویدہ ہو جاتی ہے۔ شیدائیوں اور سوالات کی تو یہ کیفیت ان کی محفل میں ہوتی تھی۔

س۔ بعض لوگ حضرت علامہ کو ڈاڑھی رکھنے کا مشورہ دیتے تھے' لیکن حضرت علامہ نے ایسا نہیں کیا!

ج۔ علامہ اقبال ان سے کہا کرتے تھے کہ بھئی اس

وقت تک عام تاثر یہ ہے کہ دین کے متعلق وہ ہی کچھ کہہ سکتا ہے یا جان سکتا ہے' جس کی ایک خاص شبیہہ ہو' خاص وضع قطع ہو' اور یہ ہمارا جو نیا طبقہ' نئی نسل یا نوجوان طالب علم ہیں ان کے دلوں میں یہ (Complex) سا پیدا ہو گیا ہے' میں اس (Complex) کو دور کرنا چاہتا ہوں' کہ نہیں' تم بھی دین کو سمجھ سکتے ہو' تمہیں بھی دین کے متعلق معلومات حاصل ہو سکتی ہیں اور اس کے لئے میں اپنے آپ کو بطور ایک مثال کے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ دیکھئے میری وضع قطع ایسی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود تم جانتے ہو کہ مجھے دین کے متعلق بہت کچھ معلوم ہے' یہ دنیا کہتی ہے اور علماء کرام بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں' پس اس (Complex) کو نکال دو کہ جب تک تمہاری ایک خاص وضع قطع نہ ہو گی تم دین کا علم حاصل نہیں کر سکو گے یا دین کے متعلق کچھ نہیں جان سکو گے۔

س۔ اقبال کے افکار کی وسعت' ان کی بلندی اور ان کی گہرائی بے پایاں ہے۔ آپ نے علامہ کے افکار کے حوالے سے ان کی شخصیت کے کس پہلو کو زیادہ نمایاں طور پر محسوس کیا؟

ج۔ میں قرآن کا طالب علم ہوں اور قرآن ہی کی کشش سے میں حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے قرآن کریم کے متعلق جو کچھ کہا اس کا میرے دل پہ بڑا اثر تھا اور اثر یہ ہے کہ قرآن کریم کا سمجھنا میں نے حضرت علامہ سے سیکھا تھا۔ ان کی شخصیت کا یہی پہلو تھا جو مجھے ان کے قریب لے آیا۔ انہوں نے اپنی پہلی تصنیف ''اسرار خودی'' یا ''رموز بیخودی'' کے آخر میں کہا ہے کہ جو کچھ میں نے سمجھا ہے' اپنی بصیرت کے مطابق قرآن ہی سے سمجھا ہے۔ قرآن کریم کی عظمت اور اس کا احترام میرے دل میں بھی چونکہ بدرجہ نہایت تھا' اس لئے میں جو ان کے قریب ہوا' تو اس کی یہی وجہ تھی۔ باقی چیزیں وہ قرآن کے تابع رکھتے تھے مثلاً دنیا بھر کے علوم پر ان کی نگاہ تھی' لیکن کسی علم یا مذہب کے متعلق جو بحث بھی وہ چھیڑتے' آخر میں وہ قرآن کی طرف آ جاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ قرآن اس کے متعلق یوں کہتا ہے۔ میرے نزدیک ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں اور جاذب پہلو ان کی یہ بصیرت قرآنی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان کی شخصیت کو سمٹایا جائے' تو ان کے افکار کی وسعت' ان کی بلندی اور ان کی گہرائی' سب کچھ اس میں سمٹ کر آ جاتا ہے۔

س۔ علامہ ایک مستقل نظام فکر رکھنے والے معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے' ان کے نزدیک اس مثالی معاشرے کے خدوخال کیا تھے؟

ج۔ ہاں' یہ وہ سوال ہے جس میں حضرت علامہ کا سارا پیغام سمٹ کر آ جاتا ہے۔ درحقیقت قرآن سے پہلے پوری دنیا میں مذہب کے متعلق تاثر' خیال اور عقیدہ یہ تھا کہ یہ خدا اور بندے کے درمیان ایک نجی تعلق (Private Affair) کا نام ہے جو پوجا پاٹھ' پرستش' بندگی اور عبادت کے ذریعے سے قائم ہوتا ہے یا مراقبوں اور ریاضتوں کے توسل سے' دنیاوی معاملات سے ان کا کوئی تعلق نہیں' مگر قرآن حکیم نے آ کر اس کی تردید کی اور بتایا کہ نہیں' ایسا ہرگز نہیں' ضمناً مذہب کا لفظ تو قرآن میں ہے ہی نہیں' اس میں

دین کا لفظ ہے' ہماری یہ بدبختی ہے کہ قرآن حکیم یا عربی زبان کے یہ جو الفاظ ہیں' ان کے مترادفات دنیا کی کسی بھی زبان میں نہیں ہیں' جب ہم ان کا ترجمہ کرتے ہیں تو ان زبانوں میں جو (Concepts) یا تصورات ہوتے ہیں وہیں سے ہم یہ الفاظ لیتے ہیں' اس لئے ہم نے دین کا مترادف مذہب (Religion) لیا۔ جو صحیح نہیں ہے۔ قرآن یا اسلام درحقیقت مذہب کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ حضرت علامہ بھی جو کتاب لکھنا چاہتے تھے اور جس کے لئے وہ (Notes) چھوڑ گئے' انہوں نے ایک فقرے میں یہ کہا ہے کہ :

''اسلام (Religion) کے خلاف (Protest) ہے''

صد حیف کہ اقبال وہ کتاب لکھ نہ سکے۔ میں یہ کہنے کی جسارت تو نہیں کرسکتا کہ میں نے ان کے موضوع کو اپنایا' بہرکیف یہ ان ہی کا فیضان ہے کہ میں نے Islam, A Challenge to Religion لکھی۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام مذہب کے خلاف ایک چیلنج تھا۔ مذہب کا جو تصور (Concept) رہا ہے کہ دنیوی معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں' قرآن نے اس کو غلط ثابت کیا ہے۔ بنابریں وحی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیوی امور کو ابدی اقدار کے تابع رکھ کر حل کرے۔ حضرت علامہ نے اسے ایک مصرعہ میں یوں سمو دیا ہے کہ ع

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

دین کی چابی سے دنیا کے ہر دروازے کو کھولا جا سکتا ہے اور یہی ہے دین اسلام کا کام' قرآن نے ہمیں یہی سکھایا ہے۔

اب جہاں تک دنیوی امور کا تعلق ہے' ان میں مملکت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ دنیوی امور دراصل مملکت ہی کے ذریعے طے پاتے ہیں' گویا اسلام وہ ہے جس میں مملکت اقدار خداوندی کے تابع رہ کر دنیوی معاملات کا حل پیش کرتی ہے اس میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں رہتے بلکہ ایک ہو جاتے ہیں۔ حضرت علامہ اس بارے میں اتنے محتاط تھے کہ انہوں نے لکھا ہے :

''میں تو یہ کہوں گا اور تمہیں یہ بھی نہیں کہنا چاہئے کہ :
یہ ایک حقیقت کے دو رخ ہیں''۔

مقصود حضرت علامہ کے کہنے کا یہ تھا کہ دو رخ ہونے میں بھی کچھ ثنویت (Dualism) کا تاثر آ جاتا ہے اس لئے کہ ع

گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں عرض کروں گا کہ جب اسلام میں ملوکیت در آئی تو اس نے آ کر پھر یہ ثنویت پیدا کر دی۔ مملکت' سلطنت اور دنیا کے معاملات حکومت نے اپنے پاس رکھ کر ایک الگ دائرہ قائم کر لیا۔ مذہب کے معاملات انہوں نے علماء کو دے دیئے' اس طرح سے دو علیحدہ علیحدہ مملکتیں قائم ہو گئیں' جنہوں نے باہم معاہدہ کر لیا کہ وہ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔ اس طریق کار سے وہ تصور ابھر آیا' جو اسلام سے پہلے رائج تھا اور جس کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ ہمارے ہاں ہزار برس سے یہی تصور چلا آ رہا تھا' ثنویت چونکہ حکومت اور مذہبی

پیشوائیت دونوں کے لئے مفید تھی' اس میں دونوں کو الگ الگ اقتدار کے دوائر حاصل تھے' اس لئے حکومت نے تو اس کو مستحکم سے مستحکم تر کرنا ہی تھا' مذہب پرست طبقے نے بھی ہمارے ہاں ان گروہوں کو اور زیادہ مضبوط کیا' چنانچہ کیفیت یہ ہوگئی کہ اذہان نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ مملکت اور مذہب یکجا ہو سکتے ہیں' حضرت علامہ کا یہ زندہ جاوید کارنامہ تھا کہ انہوں نے فرمایا۔ ع

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

حضرت علامہ واشگاف انداز میں فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کی رو سے اسلام ایک نظام زندگی ہے' ایک ضابطہ حیات ہے' جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو مستنیر کرتا ہے۔ عبادت' مناصب اور امور مملکت کو اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور یہ اسی صورت میں زندہ ہو سکتا ہے کہ اپنی ایک آزاد مملکت ہو۔

س۔ حضرت علامہ کے ذہن میں کس قسم کے مستقل نظام کا نقشہ تھا؟

ج۔ وہ ابدی حقائق' اصول یا اقدار' جو خدا کی طرف سے ودیعت کئے گئے' وہی مستقل اور غیر متبدل ہیں۔ حضرت علامہ نے یہ تصور دیا تھا کہ آپ ان مستقل اقدار کو بطور حدود کے لیجئے' یہ غیر متبدل رہیں گی۔ ان حدود کے اندر رہ کر بھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزوی قوانین یا اس کے جزوی پروگرام کی جزئیات' ہر دور کی امت باہمی مشاورت سے خود متعین کرے گی' اس طرح سے یہ غیر متبدل اور تغیر کے امتزاج سے زمانے کے ساتھ ساتھ بلکہ زمانے کی امامت کرتا ہوا نظام آگے بڑھے گا۔ مستقل نظام کی یہ ایک شکل ان کے ذہن میں تھی۔ اقبال' قرآن حکیم کو اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب سمجھتے تھے' ان کا ایمان تھا کہ اس کتاب کو قیامت تک کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن قیامت تک امت کی ہر سیاست' مملکت اور امور دنیا کا ایک دستور اساسی رہے گا' اس اعتبار سے یہ ایک مستقل نظام ہوا' لیکن جو اس کی جزئیات ہیں' وہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی چلی جائیں گی۔ بالفاظ دیگر مستقل اور تغیر پذیر عناصر کے امتزاج سے یہ نظام بنتا ہے۔ مستقل نظام کا یہی نقشہ حضرت علامہ کے ذہن میں تھا۔ یہ تصور انہوں نے قرآن سے لیا اور یہی قابل عمل تصور تھا۔ اقبال چاہتے تھے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی ایک الگ مملکت ہو' جس میں اس نظام کو نافذ کریں اور اس کی جزئیات کو ممکن العمل بنائیں' اور اس کے جو انسانیت ساز نتائج ظہور پذیر ہوں' انہیں دیکھ کر پہلے مسلمان مملکتیں غالباً اور اس کے بعد دنیا کی دوسری اقوام بھی اس کی طرف لپک کر آ جائیں گی۔

س۔ اقبال کے ذہن میں اسلامی نظام کا کیا تصور تھا؟

ج۔ اس زمانہ میں سب سے بڑا اعتراض یہ پیدا ہوا تھا کہ مسلمانوں میں اس قدر فرقے ہیں جن کی موجودگی میں ایک اسلامی مملکت' ایک اسلامی نظام یا ایک اسلامی دستور پر متفق ہونا کیسے ممکن ہے؟ علامہ اقبال اس کے جواب میں فرماتے تھے:

''ٹھیک ہے' فرقوں کی موجودگی میں جانتا ہوں' لیکن

ان سب کے اندر قرآن ایک قدر مشترک ہے؟ اگر ان کی اساس قرآن ہوگی' تو اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا''۔

''فکری روابط کی بڑی اہمیت ہے' ان حضرات (ائمہ کرام' جنہوں نے فقہ مرتب کی) نے اپنے اپنے وقت میں بڑا کام کیا ہے۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں' لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں' اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے''۔

حضرت علامہ کہتے تھے کہ یہ پچھلے حالات تھے' مگر اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام ان تمام نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے' جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکر انسانی کی نشو و ارتقاء سے وجود میں آ گئی ہیں' اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔۔اس لئے انہوں نے کہا کہ :

''خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے' اس کی مقتضی ہے کہ۔۔۔''۔

یہ ہیں وہ الفاظ جو بڑی اہمیت رکھتے ہیں :

''ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے رہنمائی لے سکتی ہے' لیکن اسلاف کے فیصلے اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔''

حضرت علامہ اقبال کے چھٹے خطبے میں' جس کا ایک اقتباس میں نے سنایا ہے' اس کی تفصیل ملتی ہے۔ یہی وہ عملی طریق یا پروگرام ہے' جس کی رو سے وہ اس سرزمین کو اسلامی نظام کا گہوارہ دیکھنے کے متمنی تھے۔

س۔ اقبال نے جس جہانِ نو کا خواب دیکھا تھا۔ کیا ہم اس کے مطابق صحیح رخ پر آگے بڑھے ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ پیش رفت تو درکنار' ہم بہت پیچھے چلے گئے ہیں جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے کہ ۱۹۳۰ء میں جب حضرت علامہ نے یہ تصور پیش کیا تو کہیں سے کوئی آواز نہ اٹھی تھی۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۰ء تک قائداعظم جب اس تصور کو لے کر آگے بڑھے تو بیم و رجا کا عالم تھا' اس زمانے میں مخالفت کچھ سطحی سی تھی اس کے بعد جب یہ تصور عملی صورت اختیار کرنے لگا تو مخالفت نظریاتی ہوتی چلی گئی اور اس میں تندی و تیزی اور تلخی بھی آتی چلی گئی۔ بالآخر پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مملکت کیا تھی؟ یہ تصور کیا تھا؟ یہ عمل کیا تھا؟ یہ عمل' یہ تصور اور یہ مملکت ثنویت کو مٹانے کے لئے تھی۔ پاکستان میں اقبال کے تصور کا اسلامی نظام اسی صورت میں قائم ہو سکتا تھا کہ یہ ثنویت باقی نہ رہتی۔

اس میں کلام نہیں کہ اسلام کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر حکمرانی کا حق نہیں دیتا' اقتدار کی کوئی بھی شکل ہو' اسلام انسانوں پر اقتدار کو ختم کر دیتا ہے۔

اگر پاکستان میں اقبال کے تصور کی مملکت معرض وجود میں آ جاتی تو مذہبی پیشوائیت کی یہاں کوئی گنجائش نہ رہتی'

حکمران طبقے نے اپنے دور کے سیکولر نظام یہاں رائج کئے۔ نام تو سارے اسلام کا لیتے رہے' کیونکہ اسلام کے نام پر دس سال بلکہ اس سے بھی زیادہ یعنی ۱۹۳۰ء سے جنگ لڑی تھی' اب یہ کس طرح ممکن تھا کہ یہ لوگ اسلام کا نام لئے بغیر اپنے مقاصد کو عملی جامہ پہنا سکتے۔

یہاں مجھے اجازت دیجئے کہ درمیان میں کہیں ''میں'' آ جائے' جس سے میں ہمیشہ گریز کرتا رہا ہوں' میں طبعاً کچھ ایسا واقع ہوا ہوں' لیکن بعض دفعہ؟ ع بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر۔

افسوس' اقبال نے جس جہان نو کا خواب دیکھا تھا' وہ پورا نہ ہوسکا۔ مگر میں مایوس نہیں ہوں۔ اقبال نے وہی کچھ کہا جو قرآن نے کہا ہے اور ہمارا تو ایمان ہے کہ اس نظام (اسلام) نے دنیا کے ہر نظام پر غالب آ کر رہنا ہے۔ اگر ہم شروع ہی سے نوجوان طبقے بالخصوص طلباء کے نصاب ہی سے اقبال کو لازم کر دیتے تو آج ہمیں قنوطیت کا شکار نہ ہونا پڑتا۔ اب بھی اگر یہ انتظام ہو جائے تو اقبال کا تصور نئی نسل کے رگ وریشے میں سما سکتا ہے۔ میں تو اقبال کے اس تصور کو' اس پیغام کو عام کرتا رہوں گا' یہ میرے ایمان کا جزو ہے' یہ میرے دین کا فریضہ ہے۔ آخر میں' میں عرض کروں گا کہ علی گڑھ یونیورسٹی قائم ہوئی' تو پاکستان کی مملکت معرض وجود میں آ گئی' اگر یہاں بھی ایک ایسی درسگاہ قائم ہو جائے اور اقبال کے تصور کو نصاب کا حصہ بنا دیا جائے' تو اقبال نے جس جہان نو کا خواب دیکھا تھا' وہ شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے۔ (ہاں)۔ حضرت علامہ نے فرمایا تھا۔

''زود یا بدیر یہ سوال مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اصل مسئلہ یہ ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی' اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہئے' بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے''۔

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اقبال کے پیغام اور ان کی فکر کو عام کرنے کے لئے ہم کہاں تک آگے بڑھے ہیں؟ اور اگر نہیں بڑھے تو کس سمت کو جا رہے ہیں۔ درحقیقت مخالفینِ اقبالؒ کی خواہش ہے کہ ع

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

اس دور میں جس کو شرعِ پیغمبری یا نظامِ اسلامی کہا جا سکتا ہے وہ تو اقبال کے تصور سے پیدا ہوتا ہے' (اور اب) ہم آہستہ آہستہ وہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ مذہبی پیشوائیت جس کا دائرہ ابتداء میں مذہب تک محدود تھا اب سیاست میں بھی در آیا ہے' حالت یہ ہوگئی ہے کہ ہم آگے نہیں بڑھے' بلکہ بہت پیچھے چلے گئے ہیں' اور ہماری یہ کیفیت تاریخ کے کسی دور میں بھی نہیں ہوئی کہ مذہب پرست طبقہ سیاست کے اوپر آ کر حاوی ہو جائے۔

س۔ کیا یہ بات نہیں کہ اقتدار ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں رہا' جو مذہب سے بیگانہ تھے اور صرف سیاست جانتے تھے؟ اس لئے اگر یہ تجربہ بھی دیکھ لیا جائے تو کیا

مضائقہ ہے؟

ج۔ مگر میری ذاتی رائے میں اگر انتخابات میں ایسا ہوا' تو ہوسکتا ہے' مذہبی طبقہ اس فکر میں ہے کہ اقبالؒ کی فکر آگے نہ آئے۔ حکمران طبقوں کے مفاد میں بھی یہ بات ہے کہ سیکولر نظام ہی رہے۔ سرمایہ دار طبقہ کی بھی یہی خواہش ہے' کیونکہ یہ ان کے مفاد میں ہے' اقبال اور قرآن سرمایہ داری کے مخالف ہیں۔ (یہ سب گروہ) فکر اقبال کے مخالف ہیں کیونکہ یہ طبقے نہیں چاہتے کہ یہاں سلامی نظام رائج ہوجائے۔

س۔ تو پھر اقبال کی فکر کو عام کون کرے گا؟

ج۔ جس کو جرأت نصیب ہوگی' وہی اقبال کی فکر کو عام کرے گا۔ ایسی جرأت جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروقؓ کو بخشی تھی' بقول اقبال:

''وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے وہ جسے رسول اللہ صلعم کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے''۔

جرأت کے فقدان کے بغیر اقبال کا تصور یا پیغام عام نہیں ہو سکتا۔ جرأت کے بغیر یہ تصور' یہ پیغام یا تو شاعری ہوجائے گا یا پھر قوالوں کی ڈھولک پر گایا جائے گا۔

(بشکریہ فکر و نظر' اسلام آباد' نومبر' دسمبر ۱۹۷۷ء)

سیلاب زدگان کی بحالی و امداد

ادارہ باغبان ایسوسی ایشن کے تمام عہدیداران' تاحیات ممبران' عام ممبران' متفقین' ہمدرد اور باغبان ایسوسی ایشن کو بنظرِ تحسین دیکھنے والے تمام خواتین و حضرات سے پُرزور اپیل کرتا ہے کہ وہ سیلاب زدگان کی بحالی و امداد کا سلسلہ بدستور جاری رکھیں۔ اگر مناسب خیال کریں تو تفصیل سے آگاہ بھی کردیں۔

حکومت نئے شہر بسانے کی سوچ رہی ہے اس سلسلہ میں خاص کر حکومت پنجاب سے استدعا ہے کہ سال 2006ء بندوبست اراضی کا سال تھا' جس میں بندوبست اراضی نہیں کیا جا سکا۔ اب بندوبست اراضی کے ساتھ بحالی و آبادکاری ایک ساتھ شروع کی جائے تاکہ بے زمین' بے مکان تمام لوگ ان اصلاحات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

پتہ رابطہ:

ملک حنیف وجدانی' صدر باغبان ایسوسی ایشن' سنبل سیداں' نیومری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عیدالضحیٰ

جناب پرویز کی وہ تقریر جو نشرگاہِ دہلی سے 29 دسمبر 1941ء کی شام کو نشر ہوئی۔ (طلوع اسلام)

مذہب کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک فرد کی ذاتی اصلاح کا ذریعہ ہے اس میں شبہ نہیں کہ افراد کی ذاتی اصلاح نہایت ضروری ہے لیکن یہ اصلاح اصل مقصد نہیں۔ عمدہ گھڑی کے ہر پرزہ کے لئے مضبوط اور درست ہونا ضروری ہے' لیکن اگر یہ پرزے الگ تھلگ پڑے ہوں تو ان کی پائیداری اور مضبوطی کسی کام کی نہیں۔ یہی پرزے جب ایک نظام کے تحت' ایک خاص ترتیب سے' ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو ان میں سے ہر پرزہ کی حرکت' دوسرے پرزوں پر اثر انداز ہوگی اور اس طرح ان کی اس مجموعی حرکت کا جیتا جاگتا نتیجہ' محسوس شکل میں' گھڑی کے ڈائل پر نمودار ہو جائے گا۔ اسلام افراد کی اصلاح سے ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو نظامِ انسانیت کو عدل پر چلا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے ایک ایسا عملی پروگرام مرتب کر دیا ہے جس میں ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ نماز کے لئے پانچ وقت کا اجتماع۔ تقویٰ۔ ضبطِ نفس۔ غیر اللہ کی محکومی سے انکار۔ اللہ کی حاکمیت کا اقرار۔ مرکزیت۔ اجتماعیت۔ اطاعتِ امام کا عملی مظاہرہ ہے۔ جمعہ کے اجتماع میں یہ دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ عید کی تقریب پر اس کی حدود اور زیادہ پھیل جاتی ہیں اور بالآخر حج کے میدان میں اس کی وسعتیں ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں۔ رمضانِ مبارک کے پورے مہینے کی مشق و ریاضت کے بعد جب ذہنوں میں جلا۔ دلوں میں تازگی ایمان' نگاہوں میں مومنانہ فراست اور خون میں مجاہدانہ حرارت پیدا ہو گئی تو عیدالفطر کے اجتماع میں ہر مقام سے ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی کے لئے بہترین افراد کا انتخاب ہوا۔ مسلم نمائندوں کے یہ قافلے دنیا کے دور دراز گوشوں سے جنگل' بیابان کوہ اور دریا کے مرحلوں کو طے کرتے ہوئے۔ **مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْق** اپنی بین الملی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے چاروں طرف سے ایک مرکز کی طرف سمٹے چلے آ رہے ہیں۔ دنیا میں کوئی جماعت بلا مرکز قائم نہیں رہ سکتی۔ مسلمانوں کے فکر و نظر کا مرکز قرآن۔ اطاعت کا مرکز امیر اور اجتماعیت کا مرکز وہ بیت الحرام ہے

جوایک خدا کے ماننے والوں کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں سے وجود میں آیا اور دنیا کے بتکدوں میں خدا کا پہلا گھر کہلایا۔ اِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبَارَكاً وَهُدًى لِّلْعَالَمِيْنَ o (3:95) بلاشبہ پہلا گھر جو تمام انسانوں کے لئے (بطور مرکز) بنایا گیا ہے وہ یہی ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ **ومن دخلہ کان امنا** o جو کوئی اس کے حدود میں داخل ہوا وہ امن اور حفاظت میں آ گیا۔

اسلام دنیا میں جس نظام کو قائم کرنے کے لئے آیا ہے اس کی بنا اس اصول پر ہے کہ تمام انسان ایک برادری کے فرد ہیں وہ ان تمام غیر فطری حد بندیوں کو توڑنے کے لئے آیا ہے۔ جن سے انسانوں کی یہ برادری مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ نسل کا امتیاز۔ رنگ اور زبان کا امتیاز۔۔ جغرافیائی حدود کا امتیاز اس کے نزدیک سب غیر فطری حد بندیاں ہیں۔ اس لئے خدا کے اس گھر میں جب انسان جمع ہوں گے تو باطل کے ان امتیازات میں سے کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ چینی۔ جاپانی۔ ہندی۔ افغانی۔ ایرانی۔ تورانی۔ حبشی۔ افرنگی سب ایک ملت کی شکل میں اس عظیم الشان حقیقت کا اعلان کرنے کے لئے جمع ہوں گے کہ

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

یہی نہیں بلکہ۔ مختلف قسم کے لباسوں سے جو اعلیٰ اور ادنیٰ کے امتیاز کی جھلک نمودار ہو سکتی ہے اسلام نے اسے بھی روا نہیں رکھا اور حکم دے دیا کہ ارضِ حرم میں داخل ہونے سے پہلے سب ایک ایک بن سلی چادر میں لپٹے ہوئے حاضر ہوں۔ تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔ یہ ہے وہ وردی جو اسی بین الملی کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کے لئے تجویز کی گئی ہے۔ یوں باطل کے ہر امتیاز کو مٹاتے' وحدت کے رنگ میں رنگے یہ قافلے چاروں طرف سے' اپنے مرکز کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ سب ایک آقا کے غلام' ایک حاکم کے محکوم' ایک قانون کے تابع' ایک نظام کے پابند' فقیرانہ لباس' ننگے سر' گدایانہ وضع' قلندرانہ ادائیں' سکندرانہ جلال۔ دنیا بھر کے آستانوں سے بے نیاز' مستانہ وار گذرتے ہوئے ایک کی چوکھٹ پر سر جھکانے کے لئے بے تاب۔ دل وفور شوق سے بے قرار' آنکھیں مئے توحید سے نشہ بار **لبیک اللھم لبیک** کہتے ہوئے یوں رواں دواں' جانب مرکز کھنچے چلے آ رہے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں' رنگ و بو کی فضاؤں کے جوہر اپنے سینوں میں بھر کر سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے شام کے وقت اپنے چھتے کی طرف پروانہ وار اڑتی چلی آ رہی ہوں کہ اپنی محنتوں کا سرمایہ' تگ و دو کا ماحصل۔ مرکز میں لا کر اکٹھا کر دیا جائے۔

زمانۂ ابراہیمیؑ میں رواج تھا کہ عہد و پیمان کی

پختگی کے لئے ایک پتھر پر ہاتھ مارتے تھے۔ جب ان رہروانِ منزلِ شوق کے قافلے۔ حریمِ کعبہ میں پہنچے تو اس عہد و پیمان کی تجدید کے لئے جوانہوں نے اپنے اللہ سے باندھ رکھا ہے۔ حجرِ اسود کو چُھوا۔ بعض نے ہجوم کی وجہ سے دور ہی سے اشارہ کر دیا۔ کسی نے پیمان کے تقدس کی رعایت سے ہاتھ کو چوم لیا اور یوں اس عہد کی تجدید ہوئی کہ

ان صلاتی و نسکی و محیای ومماتی للہ رب العٰلمین لا شریک لہ وبذالک امرت وانا اول المسلمین ○ میری نماز۔ میرا حج۔ میرا جینا۔ میرا مرنا سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں۔

اس عہد و پیمان کی تجدید سے' وجد و مسرت اور سرمستی و شیفتگی کی وہ کیفیت طاری ہوئی کہ والہانہ انداز میں خدا کے اس گھر کے گرد' پروانہ وار گھوم رہے ہیں۔ کوئی کعبہ کی چوکھٹ پر سر رکھے محوِ نیاز ہے' کوئی اس کا غلاف تھامے عالمِ وارفتگی میں جھولی پھیلائے کھڑا ہے۔ دل میں مقدس آرزوؤں کا ہجوم۔ آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو۔ لب پر دعائیں۔ محویت کا عالم۔ آسمان سے نور کی بارش۔ رحمتوں کا نزول۔ غرضیکہ ایک نئی دنیا اور ایک عجیب سماں ہے۔

خمخانۂ حجاز کے متوالوں کے یہ قافلے 8 تاریخ کو عرفات کے میدان کی طرف روانہ ہو گئے۔ پاک اور صاف' سر سے پاؤں تک للّٰہیت میں ڈوبے ہوئے۔ قدم وادیٔ مکہ میں۔ نگاہیں عرشِ معلّٰی پر' کوئی تیز گام کوئی آہستہ خرام۔ کشاں کشاں' 9 تاریخ کو اس میدان میں آ جمع ہوئے۔ کیسا حسین نظارہ ہے۔ سب ایک آقا کے غلام' ایک ملت کے فرد ایک ہی وضع' ایک ہی انداز' بھائی سے بھائی ملا۔ ایک کا دوسرے سے تعارف ہوا کہ اس مقام کا نام ہی عرفات کا میدان ہے' اجتماع کیا ہے؟ مساوات اور محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ جس میں ہر قطرہ' اپنے آپ کو خود سمندر محسوس کرتا ہے۔ یہ سب خدا کے حضور جمع ہوئے۔ ان کا منتخب امام منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آیا۔ اس نے ملت کی اجتماعی حالت پر تبصرہ کیا اور سال بھر کے لئے ایک مرتب شدہ پروگرام کا اعلان کر دیا۔ جس کی تکمیل کے لئے دعائیں مانگی گئیں' التجائیں کی گئیں اور یوں یہ عظیم الشان اجتماع۔ زندہ آرزوؤں کی ایک نئی دنیا اپنے جلو میں لئے۔ دوسری صبح منیٰ کے میدان میں آ گیا۔ یہی وہ میدان ہے جہاں ملتِ حنفیہ کے پیشوائے اعظم۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لئے پیشانی کے بل لٹا دیا تھا اور یوں اپنے ایمان محکم کا عملی ثبوت دیا تھا کہ تیرا حکم ہو تو عزیز ترین متاع بھی بلا تامل نثار کر دی جا سکتی ہے۔ اس صحرائی قربانگاہ میں پہنچ کر ملتِ اسلامیہ کے ان نمائندوں نے اس اقرار کو دہرایا کہ تیرا نام

بلند کرنے کے لئے جو پروگرام مرتب ہوا ہے اس کی تکمیل میں جس قربانی کی ضرورت ہوگی۔ بلا دریغ کر دی جائے گی۔ یہاں پہنچ کر مختلف ملکوں کے نمائندوں نے اپنے اپنے خیمے لگائے۔ یہ سب اللہ کے مہمان ہیں اس لئے خود ہی مہمان اور خود ہی میزبان ہیں آج صبح ہندی مسلمانوں کے ہاں سب کے کھانے کا انتظام ہے شام کو ایرانیوں کا اہتمام ہے۔ ان دعوتوں کے لئے قربانیاں کی جا رہی ہیں۔ سامان تو کھانے پینے ہی کا ہے لیکن چونکہ وہ مقصدِ عظیم جس کے لئے یہ اجتماع ہوا ہے خالصتاً اللہ کے لئے ہے اس لئے یہ دعوتیں بھی دنیا کی دعوتوں سے نرالی ہیں۔

لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِن يَنَالُهُ التَّقْوَى مِنكُمْ كَذَلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ (22:37)- اللہ تک ان قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ بلکہ تمہارے دل کا تقویٰ۔ پاکیزگی مقصد پہنچتی ہے۔ اس نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے لئے مسخر کر دیا کہ تم اللہ کی راہنمائی پر اس کے نام کو بلند کرو۔ اور نیک کرداروں کے لئے بشارت ہے۔ دعوتیں اور ضیافتیں ہیں۔ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک والوں کو اپنے مقامی حالات سے آگاہ کر رہے ہیں' دماغی اور قلبی تعارف ہو رہا ہے۔ ادھر ادھر مختلف ملکوں کی مصنوعات کی نمائش لگ رہی ہے۔ خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ **لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ (2:198)** اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم (حج میں) اپنے رب کا فضل (یعنی معیشت) کماؤ۔ اس طرح یہ اجتماع ملت اسلامیہ کے لئے دینی اور دنیاوی۔ سیاسی۔ اقتصادی۔ معاشی۔ معاشرتی فوائد کا ذریعہ بن رہا ہے کہ حج کا مقصد یہی ہے **لیشھدوا منافع لھم** تاکہ لوگ اپنے فوائد کے لئے حاضر ہوں۔

تین دن تک یہ اجتماع رہا جس میں عالم اسلامی کے ہر گوشے اور ملت اسلامیہ کے ہر شعبے کے متعلق باہمی تبادلہ خیالات ہوا۔ ادھر یہ ہو رہا ہے۔ ادھر تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ملت کے افراد۔ اپنے اپنے ہاں وادیٔ مکہ کے اجتماع سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے عیدگاہوں میں جمع ہو رہے ہیں۔ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے نیز اس پروگرام کو سننے کے لئے جس کا اعلان ایک دن پہلے میدان عرفات میں ہوا ہے۔ اس پروگرام کی اطلاعیں ریڈیو' ٹی وی' انٹرنیٹ اور تار برقی سے تمام عالم اسلامی تک پہنچ چکی ہیں۔ مقامی مسلمان عیدگاہوں میں پہنچے۔ اپنے اپنے خطیبوں سے اس پروگرام کو سن لیا اور سمجھ لیا جس پر اب سال بھر عمل کیا جائے گا۔ وہ تھا حج یہ ہے عید۔ وہ فریضۂ مقدس جس میں نوعِ انسانی کے قیام و بقاء کا راز ہے۔ تمام انسانوں کا اس لئے کہ مسلمان دنیا میں اپنے ہی لئے نہیں جیتا بلکہ اس کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا کو اس نظام پر چلائے جس سے انسانیت بڑھے۔ پھولے۔ پھلے اور عروج و ارتقاء کی

منزلیں طے کر کے اس منزل سے اگلی منزل میں جا پہنچے۔ حج اس نظام کی سب سے اہم کڑی اور کعبہ اس نظام کا مرکز ہے۔ **جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیَاماً لِّلنَّاسِ** (5:97)۔ اللہ نے کعبہ کو جو حرمت کا گھر ہے تمام انسانوں کے لئے (امن و عافیت کے) قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ انسانوں نے مختلف خطوط پر مختلف قسم کی جمعیتیں بنا بنا اور بگاڑ بگاڑ کر مختلف تجربے حاصل کئے ہیں اور ہر تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ۔۔۔ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی۔۔۔ یہ سب اس لئے کہ جن اصولوں پر یہ جمعیتیں بنائی گئیں وہ سب غیر فطری تھے۔ فطرت کے مطابق تو ایک ہی اصول ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کی تقسیم ملکوں اور قوموں کی رو سے نہ کی جائے بلکہ تمام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری تصور کر کے انہیں ایک مرکز کے ماتحت خدا کے قانون کے تابع رکھا جائے۔ یہی وہ عظیم الشان اصول ہے جس کی رو سے مکہ کو ''**ھدی للعٰلمین**'' تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ اور کعبہ کو ''**قیاماللناس**'' تمام نوع انسانی کے قیام کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اس جمعیت آدم کا فطری نتیجہ ہے' دنیا کا امن وسکون۔ **ومن دخلہ کان امنا** o جو اس میں داخل ہوا۔ امن وحفاظت میں آ گیا حج اور عید اسی منزل کے نشانِ راہ ہیں۔

تفسیر القرآن

از۔ سرسید احمد خان

سابقہ سات جلدیں' دو خوبصورت جلدوں میں عام ہدیہ -/1500 روپے رعایتی ہدیہ -/800 روپے۔

ملنے کا پتہ: مکتبۂ اخوت' اخوت سنٹر' (مچھلی منڈی) اردو بازار' لاہور۔

فون: 042-37235951' موبائل: 0333-4298184

ایک عظیم قرآنی خزانہ

قرآن مجید پر غور و فکر کرنے والوں کے لئے خوشخبری

مفکرِ قرآن مجید علامہ پرویزؒ صاحب کی زندگی بھر کی قرآنی بصیرت کو DVD پر دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔

قیمت 20 کراؤن فی سی۔ڈی علاوہ ڈاک خرچ میں طلب کیجئے۔

سی ڈی اور کتب کی خریداری ☆ بیرون ملک bazmdenmark@gmail.com

☆ اندرون ملک' فون: 5753666 42 92+' ای میل: trust@toluislam.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد عمر، لاہور

''بیگار ستان اور بھکار ستان کی داستان

گداگری بھی دوسروں کی کمائی پر قبضہ کرنے کی ایک شکل ہے۔ کسی کی محنت اور مال غصب کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جس کا مال چھیننا ہے وہ کمزور ہو اور چھیننے والا طاقتور۔ یہ طاقت فرد کی بھی ہوسکتی ہے، افراد کے گروہ کی بھی ہوسکتی ہے یا آج کے مہذب معاشروں میں Elite Class کے اسمبلیوں میں بنائے گئے قوانین کی بھی ہوسکتی ہے جھوٹ اور فریب کاری بھی طاقت کی ہی ایک شکل ہے۔ اسی اصول کے تحت بھکاری اپنی محتاجی کو اپنی طاقت اور دوسروں کی رحم دلی کو ان کی کمزوری بنا کر دوسروں کے مال سے بھیک حاصل کر کے یہ طبقہ گداگری کو مستقل پیشے کے طور سے اختیار کر لیتا ہے اور معاشرے پر بوجھ بنا رہتا ہے۔ دوسروں کی مدد کرنا ایک مستقل قدر ہے۔ نیک دل لوگ ناداروں، محتاجوں، غریبوں، مسکینوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ جو واقعی مدد کے حقدار ہوتے ہیں ان کے حق کو بھی غصب کرنے کے لئے نہ صرف کچھ لوگ حقداروں جیسا حلیہ بنا کر ہڈ حرامی کے مرتکب ہو کر اصل حقداروں کا بہت بڑا حصہ مار لیتے ہیں بلکہ ایسے مافیا جو بڑے بڑے بیگار کیمپ چلاتے ہیں وہ ان لوگوں کو سزا کے طور سے بازو اور ٹانگیں توڑ کر اپاہج بنا کر چوراہوں میں بھیک مانگنے کے لئے بیگار کیمپوں کے By Product کے طور سے بھکاری بنا دیتے ہیں جو بیگار کیمپوں سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں یا جو دیئے گئے کام کا ہدف پورا کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ بیگار کیمپوں میں کم سے کم خوراک مہیا کر کے زیادہ سے زیادہ مشقت لی جاتی ہے۔ اس کے لئے چاہے پاؤں میں بیڑیاں یا ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تک لگا کر کیوں نہ رکھنا پڑے۔ یہی حالت معاشرے میں قوانین کی پابندیوں میں جکڑے عام ملازمت پیشہ لوگوں کی ہے کہ ان کو اس قدر کم معاوضہ دیا جاتا ہے کہ وہ Overtime کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ زندگی کا چھکڑا تمام تر ذمہ داریوں کے بوجھ سمیت کھینچنے کے لئے ان کے پاس اور کوئی Choice ہی نہیں ہوتی۔

غاصبوں کی کوشش ہوتی ہے کہ مجبوروں کو سوچنے

کا وقت ہی نہ ملے کہ اس قید سے آزادی کی کوئی تدبیر کر سکیں۔ بیگار کیمپوں کے ان ناکارہ' قابل ترس محتاجوں اور اپاہجوں کو ٹھیکیدار طے شدہ اڈوں' چوراہوں اور علاقوں میں اپنی نگرانی میں بھیک مانگنے کے لئے چھوڑ جاتے ہیں اور ایک مقررہ وقت کے بعد ان کو وہاں سے نامعلوم مقامات پر واپس لے جاتے ہیں۔ ان کی صحت اور طبعی حالت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو انتہائی کم خوراک مہیا کی جاتی ہوگی تاکہ وہ اپنی حالت سے ہی قابل ترس نظر آئیں اور خیرات کرنے والوں کی زیادہ سے زیادہ توجہ حاصل کر سکیں۔ یہ صورت تو ملک کے اندر کی ہے۔ اقوام عالم میں ہمارا یہ عالم ہے کہ حکمرانوں نے عوام کی یہ حالت کر رکھی ہے کہ وہ اقوام جو پسماندہ رہ جانے والی اقوام کی انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت مدد کرتی ہیں ان کے سامنے یہ قوم زیادہ سے زیادہ غریب' مسکین اور نادار نظر آئے تاکہ امیر اقوام سے زیادہ سے زیادہ مدد' خیرات اور قرضے حاصل کر کے حکمران اور ان کا ٹولا امیر سے امیر تر ہوتے چلے جائیں۔ غریب عوام حکمرانوں اور Friendly Opposition کی ملی بھگت کو بھگت رہے ہیں۔ اراکین اسمبلی جن کے اثاثے دو سال میں تین گنا ہو گئے ان میں حکمران اور حزب اختلاف کے اراکین میں تخصیص نہیں ہے۔ جس طرح چوراہوں پر بھیک مانگنے والا اگر کسی حادثے میں زخمی ہو کر مزید قابل ترس ہو جاتا ہے اور رحمدل لوگوں کی توجہ زیادہ حاصل کر سکتا ہے اور یہ بات ٹھیکیدار کے دل میں خوشی پیدا کرتی ہے اسی طرح سے سیلاب کی تباہ کاریوں سے سیلاب زدگان کی حالت دنیا کو دکھا کر ہمارے حکمران مصیبت زدہ لوگوں کی دلجوئی کرنے ان کے پاس آنے کی بجائے مزید بھیک اور قرضے مانگنے کے مشن پر زیادہ وقت اور توجہ دیتے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں اقوام متحدہ کی اپیل پر تباہ حال سیلاب زدگان کی مدد کے لئے بیرونی دنیا سے اربوں ڈالر کی امداد آنے کی جو امید پیدا ہوئی ہے اس کی وجہ سے اقتدار کی کرسی پر پھر سے Musical Chair کا Music بجنا شروع ہوتا محسوس ہونے لگا ہے۔ اسی موقع پر صدر صاحب کا یہ بیان کہ سیلاب زدگان خود کو اکیلا نہ سمجھیں! صدر صاحب کے اس ذُومعنی بیان پر سیلاب زدگان مزید پریشان ہو گئے ہیں اور ان بڑے حصہ داروں کی وجہ سے مایوس و ناامید ہوتے جا رہے ہیں' کیونکہ عیدالفطر سے پہلے مدد ملنے کے وعدے وفا نہیں ہوئے اور عید کے بعد بھی بے اعتباری بڑھ رہی ہے۔ شائد دوسروں کے مال اور بھیک میں Attraction ہی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لئے تو حکومتی منصوبہ بندی قوم سے کوئی تعمیری کام لینے کے بجائے اسے بھیک مانگنے کا ذریعہ برقرار رکھنے کو ہی اپنا ہدف سمجھتی ہے اور کسی کو نظر نہیں آ رہا کہ ہم دشمن کے ہدف پر ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقطۂ نظر

خواجہ ازہر عباس، فاضل درس نظامی

اہمیت قبلہ

دین میں اللہ و رسول کی اطاعت اس زندہ اتھارٹی کی معرفت ہوتی ہے جو دین کا نظام جاری رکھتی ہے اور یہ اطاعت ایک ہی اتھارٹی کی ایک ہی اطاعت ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے ہر جگہ اللہ و رسول کی اطاعتوں کے لئے واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ لیکن جب ہمارے ہاں دین کا نظام منقرض کر کے ملوکیت غالب آ گئی تو یہ اطاعتیں بھی رد ہوگئیں، اللہ کی اطاعت تو قرآن کریم کے ذریعہ کرنا بہت آسان بات تھی، لیکن اس دور میں یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ رسول اللہ کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ اگر مسلمانوں کی قسمت یاوری کرتی تو وہ پھر اسلامی نظام جاری کر دیتے لیکن یہ تو ملوکیت کے غلبہ کی وجہ سے ناممکن ہوگیا۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی دوسری اور واحد صورت یہی تھی کہ حدیث کی اطاعت سے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کر لی جائے۔ چنانچہ اس غرض سے احادیث کے صحاح، مجامع، رسانید، جمع ہونے شروع ہوگئے اور ان کتابوں کی اطاعت رسول کی اطاعت قرار دے دی گئی۔ کیونکہ اسلامی نظام کے بغیر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا اور کوئی ذریعہ ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ حالانکہ ہمارے علماء کرام کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ عربی محاورہ کے مطابق اطاعت صرف زندہ ہستی کی ہوسکتی ہے، اطاعت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کوئی زندہ ہستی حکم دے اور اس حکم کی فرمانبرداری کی جائے۔ کتابوں کے ذریعے کسی شخص کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔ معروف و متداول درسی لغت ''مصباح اللغات'' میں اطاعت کے معنے فرماں بردار ہونا لکھا ہے ''امرہ، فاطاع، اسے حکم دیا اور اس نے اطاعت کی۔'' امام راغب افضائی نے لکھا ہے ''عام طور پر طاعۃ کا لفظ کسی حکم کے بجالانے پر آجاتا ہے'' اور اس کی سند میں انہوں نے آیات 81:4 ,21:47 پیش کی ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اس کے معنے کسی کی فرمانبرداری کرنا تحریر کیا ہے اور سند میں اطیعوا الرسول 38:4 کا حوالہ دیا ہے۔ غرضیکہ اطاعت کے لئے ضروری ہے کہ حکم دینے والا زندہ ہو اور زندہ حاکم کے حکم کی فرمانبرداری اطاعت ہے۔ کتابوں کے ذریعے اطاعت کا تصور محاورہ عرب کے خلاف ہے۔

تقریباً ایک ہزار سال کے بعد ہمارے اس دور میں پھر احادیث کے مقام کے متعلق شکوک و شبہات ظاہر

ہونے لگے اور چند بیدار مغز علماء اور چند روشن خیال دانشوروں نے حدیث کے صحیح مقام کے تعین کے سلسلہ میں پھر بحث شروع کر دی۔ اس کے نتیجہ میں ہمارے قدامت پرست علماء کرام نے حدیث کے دفاع میں تقریباً دوسو کتب تصنیف کر ڈالیں اور ان کتب میں انہوں نے حدیث کو وحی (خفی) قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک حدیث کو وحی قرار دینے کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک وجہ تو ان کی وہی مجبوری ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے کہ غیر اسلامی نظام میں حضورﷺ کی اطاعت کا واحد ذریعہ حدیث کی اطاعت رہ جاتی ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے احادیث کو وحی ہی قرار دے دیا۔ ضمناً عرض ہے کہ ہمارے علماء کرام نے یہ غور نہیں فرمایا کہ وحی سے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہے۔ وحی کے ذریعے رسول کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔ احادیث رسول کو وحی قرار دینے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ احادیث کو وحی (خفی) کا درجہ دے کر ان کو جہت شرعی قرار دے دیا گیا۔

دراصل اس عقیدہ کا محرک انسانوں کا وہی جذبہ ہے جو رسولوں کو بشری حدود سے ارفع و اعلیٰ سمجھنا ہے اور اس سے آپ کے عقلی و ذہنی قویٰ کو سہو و خطا سے بلند خیال کرنا ہے۔ چنانچہ ہمارے دور کے مشہور عالم و محدث مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور نے اپنی مشہور کتاب ''حجیت حدیث'' میں تحریر فرمایا ہے، اسے آپ غور سے ملاحظہ فرمائیے اور سر پیٹئے، وہ فرماتے ہیں ''جس طرح ٹیلیفون خود نہیں بولتا، بولنے والا پس پردہ کوئی اور ہوتا ہے اسی طرح نبی کی زبان سے جو نکلتا ہے وہ درحقیقت اللہ کی آواز ہوتی ہے'' (صفحہ 39)۔ اپنے اس نظریہ کی مزید تائید کے لئے، حضرت اقدس نے مولانا روم کا ایک شعر بھی نقل فرما دیا ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اس شعر کا ترجمہ کتاب میں یہ دیا گیا ہے، آپ کی گفتگو اللہ کی گفتگو ہوتی، اگرچہ بظاہر وہ اللہ کے بندے (نبی کریم) کی زبانِ مبارک سے ہو رہی ہے۔

آپ غور فرما رہے ہیں کہ حضرت اقدس کس طرح حضورﷺ کو عقلی و ذہنی صلاحیتوں سے فارغ قرار دے رہے ہیں حالانکہ قرآنِ کریم کے مطابق بے شک انبیاء کرام کو وحی الٰہی ملتی تھی جسے وہ بلا تغیّر و تبدیل کے انسانیت کو پہنچا دیتے تھے، لیکن اس کے علاوہ باقی تمام امور و معاملات میں جتنی خصوصیات انسانوں کی ہیں وہ سب انبیاء کرام میں ہوتی تھیں مثلاً خوش ہونا، رنجیدہ ہونا، خوف وحزن لاحق ہونا، عمدہ سے عمدہ تدابیر کی راہ نکالنا اور ان کو تدابیر کو اختیار کرنا، بیمار ہونا، نکاح کرنا، بھولنا، اپنی ازواج مطہرات سے ازدواجی تعلقات رکھنا، بچے ہونا، مشوروں میں غلطی کرنا، یہ سب خصوصیات انبیاء کرامؑ میں ہوتی تھیں۔ چنانچہ آپ کی ذات والاصفات میں بھی تمام بشری صفات موجود تھیں، قرآن کریم آپ کی ان بشری خصوصیات کا ذکر فرماتا ہے۔

(1) آپ مشورہ کرنے پر مامور ہیں (42:38, 42:48)

(2) آپ سے غلطیاں صادر ہوتی تھیں' جن پر تنبیہ نازل ہوئی۔(9:43)

(3) آپ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کل کو اس دنیا میں یا مرنے کے بعد خدا کے ہاں میرے ساتھ کیا سلوک ہونا ہے۔آپ کا حال بھی اس بارے میں عام مسلمانوں جیسا تھا۔(46:9)

(4) جیسا کہ شیطان عام انسانوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے' آپ بھی اس سے محفوظ نہیں تھے' آپ کو حکم تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کریں۔ (23:97, 7:200)

(5) چونکہ حضورﷺ سہو و خطا سے منزہ نہیں تھے' اس لئے انہیں جو تکالیف پیش آتی تھیں وہ سب ان کی اپنی وجہ سے ہوتی تھیں۔مَا اَصَابَکَ مِن سَیِّئَۃٍ فَمِن نَّفْسِکَ (4:79) اور جو مصیبت آپ پر آتی وہ آپ کے نفس کی وجہ سے ہے۔

(6) حضورﷺ غیب دان بھی نہیں تھے۔(7:188)

قرآنِ کریم سے حدیث کے وحی ہونے کی کوئی سند نہیں ملتی۔صرف قرآن کے وحی ہونے کا بار بار ذکر ہوتا ہے'تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ (25:1)' بابرکت ہے وہ ذات جس نے فرقان نازل فرمایا' اسی طرح ارشاد ہوتا ہے:وَاُوحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْآنُ (6:19) مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا ہے۔قرآن کریم کے نازل ہونے کی متعدد آیات ہیں لیکن کسی ایک جگہ بھی احادیث کے نازل ہونے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔جب علماء کرام سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اس عقیدہ کی تائید میں کہ حدیث وحی ہے' کوئی آیت پیش فرمائیں' تو وہ آیت تو پیش نہیں کرتے۔ بلکہ وہ صرف چند ایسی آیات کی نشاندہی کر دیتے ہیں کہ اگر وحی خفی کو تسلیم نہ کیا جائے' تو ان کے نزدیک وہ آیات سمجھی نہیں جاسکیں۔اس لئے وحی خفی کا ماننا ضروری ہے۔اگرچہ اصولی طور پر یہ نظریہ درست نہیں ہے کہ اگر کچھ آیات سمجھ میں نہ آئیں تو کسی غیر وحی کو وحی قرار دے دیا جائے۔تاہم اس بارے میں عرض ہے کہ ان کی پیش کردہ آیات کی تفسیر و تشریح کئی مرتبہ پیش کی جا چکی ہے۔خصوصاً ان تفاسیر میں جو تصریف آیات کے اصول کے تحت تحریر کی گئی ہیں۔اگر اس کے بعد بھی بار بار ہمارے علماء کرام اس مطالبہ کا اعادہ کرتے ہیں' تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

علماء کرام کے اس متذکرہ مطالبہ میں کہ احادیث (وحی خفی) کے بغیر وہ چند آیات سمجھ میں نہیں آئیں' دو مغالطے Involve ہیں۔

پہلا مغالطہ تو یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام ان چند آیات کی تفسیر روایات کے ذریعے کرتے ہیں' جو درست نہیں ہوتی' اور اس روایت کے ذریعے کی ہوئی تفسیر کو بطور سند و حجت کے پیش کرتے ہیں' وہ روایات کے وحی ہونے کی تائید میں خود روایات کو ہی پیش کر دیتے ہیں یعنی جو دعویٰ ہوتا ہے' اسی کو دلیل کے طور پر پیش کر دیتے ہیں' اس کی اور واضح مثال یہ ہے کہ وہ غیر مسلم جن کو قرآن کریم کے محفوظ ہونے پر شک ہو' ان کے سامنے یہ آیت پیش کی جائے' اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ (15:9)- ہم نے

قرآن نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں' تو وہ معترض یہی کہیں گے کہ جب ہم قرآن کو محفوظ نہیں مانتے تو ہم اس آیت کے منشاء کو بھی سند تسلیم نہیں کرتے۔ جو دعویٰ ہوا گر اسی کو دلیل کے طور پر پیش کر دیا جائے اس کو مناظرہ کی اصطلاح میں مصادرہ علی المطلوب کہتے ہیں جو بالبداہت غلط ہوتا ہے۔

ان کے اس مطالبہ میں دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام آیات کا جو محکی عنہٗ طلب کرتے ہیں وہ خود روایات میں بھی مذکور نہیں ہوتا ہے' اس لئے ان کی یہ دلیل تام نہیں ہے۔ اس مغالطہ کو سمجھنے کے لئے بطور مثال ایک آیت پیش کی جاتی ہے' تا کہ یہ بات واضح ہو جائے۔

جناب مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی کی کتاب ''حجت حدیث'' میں تحریر ہے: ایک بار آنحضرت نے اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی ایک کو راز کی بات بتلائی تو انہوں نے یہ راز کسی اور کے سامنے ظاہر کر دیا' جب آپ کو معلوم ہوا کہ راز ظاہر ہو چکا ہے تو آپ نے اس زوجۂ مطہرہ سے وضاحت طلب فرمائی' انہوں نے آپ سے دریافت کیا کہ اس افشائے راز کی خبر آپ کو کس نے دی۔ آنحضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے مجھے مطلع کر دیا' یہ واقعہ قرآنِ کریم میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ واذ اسر النبی بعض ازواجہ حدیثاً۔ الخ۔ (ترجمہ) اور جبکہ پیغمبر نے اپنی کسی بی بی سے ایک بات چپکے سے فرمائی پھر جب اس بی بی نے وہ بات بتلا دی اور پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر کر دی تو پیغمبر نے تھوڑی سی بات تو بتلا دی اور تھوڑی سی بات کو ٹال گئے۔ سو جب پیغمبر اس بی بی کو وہ بات بتلائی وہ کہنے لگی کہ آپ کو اس کی کس نے خبر دی۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو بڑے جاننے والے خبر رکھنے والے نے خبر کر دی''۔

ترجمے کے نمایاں الفاظ (خط کشیدہ الفاظ) اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو افشائے راز سے مطلع کر دیا تھا لیکن یہ اطلاع بھی قرآن کریم میں کہیں نہیں ہے اور اس طرح اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن کریم کے سوا ایک اور قسم کی وحی کا نزول بھی رسول اللہ پر ہوتا تھا اور یہی ''وحی غیر متلو ہے''۔ (اقتباس ختم شد)

آپ نے جسٹس صاحب کی کتاب سے اقتباس ملاحظہ فرما لیا۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے حضورﷺ کو افشائے راز سے مطلع کر دیا تھا لیکن یہ اطلاع قرآن میں نہیں ہے''۔ ہمارے علماء کرام اس سے یہ دلیل دیتے ہیں کہ یہ اطلاع حضورﷺ کو وحی خفی سے ملی تھی اور اللہ تعالیٰ نے حضورﷺ کو افشائے راز سے بذریعہ وحی خفی مطلع کر دیا تھا لیکن حیرت یہ ہوتی ہے کہ احادیث میں کسی جگہ بھی وہ الفاظ نہیں ملے جن کے ذریعے افشائے راز کی اطلاع دی گئی تھی۔ جب احادیث میں کسی آیت کا محکیٰ عنہ کے ملتا ہی نہیں' تو ان کا یہ اعتراض درست نہیں ہو سکتا' ہاں اگر وہ حدیث میں محکیٰ عنہٗ دکھا دیں تو بے شک ان کا اعتراض درست ہو سکتا ہے۔ جب احادیث میں کسی آیت کا محکیٰ عنہٗ ملتا ہی نہیں' تو ہمارے علماء کرام کا یہ دعویٰ کہ آیات کا محکیٰ عنہٗ وحی خفی کی رو سے مل جاتا تھا درست نہیں ہے۔

ہمارے علمائے کرام چند آیات کو پیش کر کے ان

کوتحویل قبلہ سے متعلق قرار دیتے ہیں اور یہی کہتے ہیں کہ یہ آیات بغیر وحی خفی کی مدد کے سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ لیکن ہمارے علماء کرام ان آیات کا مفہوم ہی غلط لیتے ہیں' اس لئے اس وحی خفی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت نمبر 142 دوسرا پارہ سیقول کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔ آیت نمبر 140 سے آیت نمبر 150 تک آپ قرآن کریم کے نسخے سے اپنے پیش نظر انہیں پھران آیات کی روایتی تفسیر کا ملخص ملاحظہ فرمائیں۔

مکہ میں حضورﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ درآنحالیکہ آپ کی خواہش یہی تھی کہ مکہ کی طرف رخ ہو۔ مکہ میں آپ اس طرح نماز ادا فرماتے تھے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں کی طرف رخ ہو جاتا تھا لیکن مدینہ منورہ میں یہ صورت نہیں ہوسکتی تھی' کیونکہ یہ دونوں مقامات مختلف سمتوں میں تھے۔ مدینہ آ کے کر بھی حضورﷺ نے تقریباً سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔ اس کے بعد خدا کی طرف سے وحی ہوئی کہ آپ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کریں' چنانچہ تفسیر مظہری میں ہے کہ آپ نے بمع اصحاب کے مسجد سلمہ میں نماز شروع فرمائی۔ جب آپ دو رکعتیں پڑھ چکے تو جبرئیل نے آ کر اشارہ کیا کہ بیت اللہ کی طرف نماز پڑھ۔ آپ نماز میں ہی کعبہ کی طرف میزاب کی جانب پھر گئے جس جگہ مرد تھے وہاں عورتیں آ گئیں اور جہاں عورتیں تھیں۔ وہاں مرد آ گئے' غرض سب نماز میں پھر گئے اسی واسطے اس مسجد کو مسجد القبلین کہتے ہیں۔ صفحہ 186۔

ان آیات کی تفسیر تمام مفسرین کرام نے بہت طویل لکھی ہے اور ان ہی آیات سے تحویل قبلہ کا ثبوت دیا جاتا ہے اور ان ہی آیات سے بیت المقدس کو قبلۂ اول قرار دیا جاتا ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں ان آیات کی پوری تفسیر نہیں آ سکتی البتہ ان کا مفہوم بیان کیا جاتا ہے۔

ہماری مروجہ تفاسیر میں اگرچہ ان آیات کی تفسیر میں سب سے نمایاں ذکر نماز میں رخ بدلنے کا آیا ہے' لیکن یہ بات بڑی تعجب کی ہے کہ ان آیات میں نماز کا دور دور کوئی تذکرہ ہے ہی نہیں۔ ان آیات کا تعلق نماز سے ہے ہی نہیں۔ اس لئے ان کی یہ تمام تفسیر ہی غلط ہے۔

قرآن کریم نے جب سابقہ تمام انبیائے کرام پر ایمان لانا واجب قرار دے دیا اور ان کی کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری قرار دیا تو یہود و نصاریٰ کو اس بات کی توقع تھی کہ اب قرآن کریم بیت المقدس کو بھی اپنی عقیدت کا مرکز قرار دے گا اب تک یہود و نصاریٰ کے عقیدتی مراکز الگ الگ تھے' جیسا کہ سلاطین باب 8' آیت 22 تا 30 سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہود کا قبلہ یروشلم تھا' لیکن یہود کا سامری فرقہ یروشلم کے ایک پہاڑ کی طرف منہ کرتا تھا اور بھی فرقوں کے قبلے الگ الگ تھے جیسا کہ **وَمَا بَعْضُهُم بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ** (2:145)- (ترجمہ) اور ان میں ایک دوسرے کے قبلے کو نہیں مانتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے' لیکن چونکہ قرآن کریم تو پوری انسانیت کا ایک مرکز بنانا تھا اس لئے ان قبلوں میں سے کسی کو قبلہ بنانا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے قرآن کریم نے باوجودیکہ کعبہ اس وقت تک بتکدہ تھا' تاہم

کعبہ کو ہی تمام دنیا کی عقیدت کا مرکز قرار دے دیا' چونکہ اسلام عالمگیر دنیا کا دین تھا اس لئے اس کے مرکز کو نسلی' قومی' عصبی' جغرافیائی حدود سے بلند ہونا ضروری تھا۔ کعبہ کو قبلہ بنانے کا اصل سبب ہی یہ تھا لیکن یہ بات یہودیوں کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اور اس دور میں عالمگیریت کا تصور آنا بھی ذرا مشکل ہی تھا۔ یہودیوں کا اصل اعتراض نماز کے بارے میں نہیں تھا ان کا اعتراض یہ تھا کہ مسلمانوں نے اپنی عقیدت ومحبت اور اپنے نظام کا مرکز بیت المقدس کی بجائے کعبہ کو کیوں قرار دے دیا۔

زیرِنظر آیات کریمات جن کو تحویل قبلہ کے واقعہ سے منسلک کیا جاتا ہے اور جن کو نماز میں کعبہ کی طرف رخ کرنے تک محدود کیا جاتا ہے' ان آیات میں **کذلک** کا لفظ بڑا معنی خیز ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ تم ایک ایسی قوم بن جاؤ گے جو تمام دنیا کی نگران ہو اور تمہارا رسول' اور رسول کے بعد' اس کا جانشین' تمہارا نگران رہے۔ ظاہر ہے کہ تمام دنیا کی نگرانی کے لئے قوت وغلبہ پہلی شرط ہے' لیکن نماز سے یہ قوت وغلبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہاں نماز کا ذکر نہیں ہو رہا ہے اور نہ ہی ان آیات کا کوئی تعلق نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنے سے متعلق ہے۔

پھر اسی آیت میں دوسرا حکم ہے: **وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّواْ وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ** (2:144)۔ اور جس جگہ تم ہوا کرو' پھیرو اپنے منہ کو اسی طرف۔ اس میں بھی ہمارے علماء کرام نماز میں کعبہ کی طرف رخ کرنے کا مفہوم لیتے ہیں' لیکن قرآن کی رو سے یہ بات صرف نماز تک محدود نہیں رہتی۔ بلکہ اس کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ میں جدوجہد سے ہے۔ مسلمان دنیا کے کسی حصہ اور کسی خطہ میں آباد ہوں ان کے سامنے ہر وقت وہ ضابطۂ حیات رہنا چاہئے جو کعبہ کے پیش نظر ہے' کعبہ یعنی کعبہ سے جاری شدہ نظام حیات ان کا مقصد زندگی ہو اور بھی مقصد حیات کبھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو۔ اس سے مسلمانوں میں یک جہتی اور یک نگاہی پیدا ہو گی اور حصول مقصد کی خواہش اور تحریک تیز سے تیز تر ہوتی چلی جائے گی۔

(محض ضمناً) عرض ہے کہ قرآنِ کریم کے اس اعلیٰ وارفع تصور کو صرف نماز تک محدود کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ حج کے دوران بھی سارے مسلمان ایک امت واحدہ نہیں بنتے' وہاں بھی مسلمان مختلف اقوام میں منقسم ہوتے ہیں اور ہر قوم کے پیش نظر صرف اپنے وطن کا مفاد ہوتا ہے حج اسلامی نظام کا سالانہ اجتماع ہوتا ہے یہ عجب بات ہے کہ اس نظام کو تو منقرض ہوئے ایک ہزار سال سے زیادہ گذر گئے' لیکن اس نظام کا سالانہ اجتماع ہوتا رہتا ہے۔ اگر یہی اجتماع اسلامی نظام کی موجودگی میں ہوتا' تو اس وقت حج کے وہی نتائج آتے جن کا وعدہ قرآن کریم نے کیا ہے۔

کعبہ سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاض
زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہو گا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سید سلیم شاہ

ایں چُنیں ارکانِ دین.....

ماہنامہ رشد کے مارچ 2010ء کے شمارے (قراءات نمبر3) میں اس عاجز کی ایک تحریر پر حافظ محمد زبیر صاحب اور عمران اسلم صاحب نے مشترکہ ردِعمل کا اظہار فرمایا ہے۔ جس کے لیے ان کا شکریہ ہی ادا کیا جا سکتا ہے۔ تاہم ہمارے اظہارِ خیال کو حافظ صاحب نے تمسخر، تحقیر اور استہزا پر محمول فرمایا ہے جبکہ عمران اسلم صاحب کا خیال ہے کہ ہم ''کافی غصے میں دکھائی دیتے ہیں'' ہمارا اب بھی یہی خیال ہے ہم نے صرف اہلِ رشد کی خدمت میں ان ہی کا چہرہ پیش کیا تھا۔

محترم حافظ صاحب کا ارشاد ہے کہ یہ کامیڈی ڈرامہ یا تھیٹر شو کا معاملہ ہوتا تو ہمارے تحقیر و تمسخر پر مبنی تبصرے کا جواب کسی اخباری کالم میں دے کر پطرس بخاری اور ابنِ انشا کی یاد تازہ کر دیتے (ص:۶۲۷)۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ موصوف ان مشہور ادیبوں کو کیا سمجھتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ حافظ صاحب نے پطرس اور ابنِ انشا کا صرف نام ہی سنا ہے یا ان کو پڑھا بھی ہے۔ اگر پڑھا ہے تو ان کی صنفِ تحریر کو تحقیر و تمسخر پر مبنی قرار دینا واقعی ایک عجوبہ ہے۔ مزاح نگاری کو تحقیر و تمسخر سمجھنا علم کا ادھورا اور کچا استعمال ہے۔ ہمارے درمیان علم و ادب کے درخشاں ستارے جناب مشتاق احمد یوسفی اور عطاء الحق قاسمی صاحب زندہ موجود ہیں۔ حافظ صاحب محترم ان سے مزاح نگاری اور تحقیر و تمسخر میں فرق بھی معلوم کر سکتے تھے اور پطرس بخاری مرحوم اور ابن انشاء مرحوم کا علمی و ادبی مرتبہ بھی۔ لیکن ادھورے علم کی وجہ سے ان میں تمیز نہ کر سکنے سے حافظ صاحب بھی کسی علمی حادثے سے دوچار ہو سکتے ہیں جس طرح مولانا رومؒ کی بیان کردہ حکایت میں ایک خاتون جو ایک کنیز اور گدھے کی مالکن تھی کنیز کی نقالی کرتے ہوئے ادھورے علم پر عمل کر بیٹھی تھی اور اپنے منطقی انجام کو پہنچی تھی۔ ہمارے عہد کے ''شرعی علوم'' کے ماہرین خصوصاً جب وہ سن رشد کو نہ پہنچے ہوں، بھلے ان کی تحریریں 'رشد' کے صفحات کی زینت بنتی ہوں، بالعموم فارسی ادب سے شغف نہیں رکھتے۔ صرف امراء القیس کے اشعار سے ہی زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اور جلوت و خلوت میں ان کو گنگناتے اور ذہنی تلذذ حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے عرض ہے کہ حافظ صاحب کسی فارسی دان 'مولوی' سے پوری حکایت سن لیں، اس میں انہی کا بھلا ہے۔ برسبیل تذکرہ انہوں نے ہمیں 'مولوی' سے

ڈرایا بھی ہے کہ وہ تمسخر کا بہترین جواب دینے کے اہل ہوتے ہیں۔ بھئی ہمیں اس بات کا علم ہے اور یقین بھی لیکن وہ ہمیں بھی اپنی برادری کا ہی فرد سمجھیں۔ دیکھیں نا مولانا رومؒ کی حکایت کا حوالہ کوئی مولوی ہی دے سکتا ہے۔ مسٹر تو شاید مولانا روم کو بھی بحیرۂ روم کی طرح کا کوئی دریا یا سمندر سمجھ بیٹھے۔

اب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ ہمارے مضمون کے جواب میں حافظ صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے صرف 'پھڑ یاں' ماری ہیں۔ (رشد ص ۶۲۸) البتہ وہ تحقیق پیش کرتے ہیں کہ:

> ''قرآن کی قراءات کا اختلاف تفسیر و بیان کا ہے اور قراءات کے جمیع اختلافات روایات حفص میں بھی موجود ہیں۔ہم جناب سلیم شاہ صاحب سے یہی سوال کرتے ہیں کہ جادوگروں نے حضرت موسیٰؑ کو ﴿قالو یا موسی اما ان تلقی و اما ان نکون اول من القیٰ﴾ (طه: ۶۵) کہا تھا یا ﴿قالو یموسی اما ان تلقی و اما ان نکون نحن الملقین﴾ (الاعراف: ۱۱۵) سلیم شاہ صاحب کے قرآن میں یہ دونوں آیات موجود ہیں۔کیا معاذ اللہ! اللہ کو یاد نہ رہا کہ جادوگروں نے کیا کہا تھا یا محمد ﷺ بھول گئے کہ جبرائیلؑ نے ان تک کیا پہنچایا تھا۔اسی طرح یہود نے کیا کہا تھا؟ ﴿وقالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودة﴾ (بقرة: ۸۰) ﴿قالوا لن تمسنا النار الا ایاماً معدودات﴾ (آل عمران: ۲۴) اسی طرح جب حضرت موسیٰؑ نے پتھر پر اپنا عصا مارا تھا تو 'فانفجرت' ہوا تھا یا 'فانبجست' اور یہ دونوں الفاظ آپ کے قرآن میں موجود ہیں۔ دیکھیں آیات ﴿فقلنا اضرب بعصاک الحجر فانفجرت منه اثنتا عشرة عیناً قد علم کل اناس مشروبهم﴾ (بقره: ۶۰) اور ﴿ان اضرب بعصاک الحجر فانبجست منه اثنتا عشرة عیناً قد علم کل اناس مشروبهم﴾ (لاعراف: ۱۶۰) اسی طرح حضرت لوطؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا: ﴿ولوطا اذ قال لقومه اتاتون الفحشة ما سبقکم بها من احد من العلمین﴾ (الاعراف: ۸۰) ﴿ولوطا اذ قال لقومه انکم لتاتون الفحشةما سبقکم بها من احد من العالمین﴾ (العنکبوت: ۲۸) اسی طرح حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعاؤں میں کہا تھا: ﴿واذقال ابراهیم رب اجعل هذا بکدا ء امناً﴾ (بقرة: ۱۲۶) ﴿واذقال ابراهیم رب اجعل هذاالبلدا ء امناً﴾ (ابرهیم: ۳۵) دونوں آیات میں 'هذا بلدا' 'هذا البلد' کا فرق واضح ہے۔اس قسم کے سینکڑوں اختلافات شاہ صاحب کے قرآن میں

بھی موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ سلیم شاہ صاحب قرآن میں قراءات کے اس اختلاف کے باوجود بھی اسے اللہ کی کتاب قرار دیتے ہیں۔ کیوں؟ (ص ۶۲۹۔۶۲۸)''

ہماری تردید کی کوششوں میں وہ اپنی ذات کو درست ثابت کرنے کے لیے یہاں تک کہہ گئے کہ ''ہوسکتا ہے کہ سلیم شاہ صاحب منطق کی کسی شاخ کا سہارا لے کر قرآن کے ان مقامات کی کوئی تاویل پیش کر دیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظی طور پر باہم متعارض ومخالف ہیں'' (ص ۶۲۹)

اس طویل اقتباس سے معلوم ہوا کہ درج ذیل آیات میں قراءات کے اختلاف ہیں:

۱) اول من القیٰ (طہ. ۶۵) اورنحن الملقین (الاعراف : ۱۱۵)

۲) ایاماً معدودۃ (البقرۃ : ۸۰) اورایام معدودات (آل عمران: ۲۴)

۳) فانفجرت (بقرہ : ۶۰) اورفانبجست (الاعراف ۱۶۰)

۴) اتاتون (الاعراف : ۸۰) اور لتاتون (العنکبوت : ۲۸)

۵) ھذا بلداً (بقرہ : ۱۲۶ اورھذا البلد (ابراھیم: ۳۵)

اور یہ اختلاف قراءات شاہ صاحب کے قرآن میں بھی موجود ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظی طور پر ہم باہم متعارض ومخالف ہیں''۔

بہت بہت شکریہ جناب ہمیں اب پتہ چلا کہ یہ قرآن اللہ کا نہیں بلکہ شاہ صاحب کا قرآن ہے۔ اور اس میں بہت سی آیات باہم متعارض ومخالف ہیں۔ بس 'مولوی' کی یہی ادا تو ہمیں مار گئی جس کا جواب دینا پڑ رہا ہے ورنہ یہ مثالیں دیکھتے ہوئے ہمیں تو صرف سورہ الفرقان کی آیت ۶۳ کی تلاوت کر دینا چاہیے تھی۔ ''رشد'' کی ان تینوں جلدوں میں اور اختلاف قراءات کی دیگر کتب میں آج تک کسی صاحب علم نے اختلاف قراءات کی یہ مثالیں نہیں دیں۔ اس کی گواہی رشد ہی کی تینوں جلدیں دے رہی ہیں۔ ہم اسی تیسری جلد میں حافظ محمد مصطفیٰ راسخ کے مضمون سے اس کی وجہ نقل کرتے ہیں:

''مشہور اہلِ علم کے نزدیک رسمِ عثمانی توقیفی ہے اور کتابت مصاحف میں اس کا التزام کرنا فرض و واجب ہے اور اس کے خلاف لکھنا حرام ہے۔ رسم عثمانی کے منجملہ فوائد اور اعجازات میں سے ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ اس سے تمام قراءات صحیحہ متواترہ نکل آتی ہیں۔ اگر قرآن مجید کو رسم عثمانی کی بجائے رسم قیاسی کے مطابق لکھا جائے تو رسم عثمانی سے نکلنے والی تمام قراءات صحیحہ متواترہ رسم قیاسی سے نہیں نکل سکیں گی اور متعدد قراءات صحیحہ متواترہ ساقط ہو جائیں گی۔ کیونکہ کسی بھی قراءات کے صحیح ثابت ہونے کے لیے منجملہ شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ قراءات مصاحف عثمانیہ کے

رسم کے موافق ہو۔ رسم عثمانی اپنی توقیفیت کی بنا پر متعدد اسرار و رموز اور حکمتوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

رسم عثمانی کے اعجازات میں سے ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ ایک ہی رسم سے تمام قراءات صحیحہ متواترہ پڑھی جاتی ہیں۔ مثلاً یَخْدَعُوْنَ، یُخٰدِعُوْنَ، فَاَزَلَّھُمَا، فَاَزَالَھُمَا اَسْرٰی، اُسٰرٰی (ص ۸۵۳، ۸۵۲) اور اسی طرح کی بہت سی مثالیں دینے کے بعد لکھتے ہیں کہ ''مذکورہ مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ رسم عثمانی کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ ایک ہی رسم سے تمام قراءات صحیحہ متواترہ پڑھی جا رہی ہیں اور کوئی قراءات صحیحہ ساقط نہیں ہوتی تھیں رسم عثمانی کے اعجاز من حیث القراءات کی چند مثالیں۔ ورنہ پورے قرآن مجید کا رسم، رسم عثمانی پر مشتمل ہے'' (ص ۸۵۶)

ان تمام مثالوں میں آپ دیکھیں گے رسم الخط ایک ہی ہے، بس اعراب کا ادھر ادھر فرق ہے۔ آئمہ قراءات کے نزدیک رسم الخط عثمانی لازماً ہو گا مگر ہماری تردید کے شوق میں 'مولوی' حافظ زبیر صاحب نے ایک ہی رسم الخط نہیں بلکہ جدا جدا الفاظ لکھ کر دعویٰ کر دیا کہ ''قراءات کے جمیع اختلافات روایت حفص میں موجود ہیں (ص 629-628)

اس رویے پر ہم حیران ہیں کہ کیا کہیں سوائے اس کے کہ اپنی طرف سے کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے مولوی زبیر صاحب کا ہی جملہ مستعار لیں کہ ''ہمارے نزدیک دنیا کا مشکل ترین کام کسی ایسے جاہل کو سمجھانا ہے جسے علم و تحقیق کا شوق چڑھ گیا ہو'' (رشد، ص ۶۳۲)

حقیقت یہ ہے کہ حافظ صاحب کی دی گئی مثالیں اختلاف قراءات کی سرے سے ہیں ہی نہیں بلکہ مفسرین کے نزدیک تصریفِ آیات کے ذیل میں آتی ہیں یا ایک ہی مفہوم مختلف اسالیب میں بیان کیا گیا ہے۔

ان اللہ غفور الرحیم اور واللہ غفور الرحیم یا اِنَّہ، غَفُوْر'' شَکُوْر'' اور اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْر'' شَکُوْر اور اسی طرح متعدد آیات میں ایک ہی مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ ان میں اختلاف ہے نہ تضاد ہے نہ یہ اختلاف قراءات کا مسئلہ ہے۔ اس کے بعد حافظ صاحب نے خالص مولویانہ ہتھکنڈا استعمال کیا ہے اور بڑی مہارت سے کیا ہے۔ اس طرح کے عملی نمونے ہم آئے دن دیکھتے رہتے ہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں ''ہم سلیم شاہ صاحب کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کی تحقیقات کے کچھ نمونے قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہیں گے''۔ لیکن جو نمونے انہوں نے اپنے قارئین کے سامنے پیش کئے ہیں۔ وہ ہماری تحریر میں اس طرح درج نہیں لیکن جن لوگوں نے اصل تحریر نہ دیکھی ہو وہ تو لازماً غلط فہمی بلکہ ہماری ''جہالت'' پر ایمان لے آئیں گے۔ انہوں نے رشد کے صفحہ ۶۳۲ پر ہماری تحریر اس جملے سے شروع کی ہے۔ ''ہم قاری (صفدر) صاحب اور حافظ (زبیر) صاحب کی بات مان لیتے ہیں'' اور ''قراءات کس طرح درست ہو سکتا ہے'' پر ختم کی ہے۔

بظاہر یہ پوری تحریر مسلسل نظر آتی ہے مگر ہم نے اس طرح لکھی نہیں۔ حافظ صاحب نے ہماری تحریر میں سے 6 سطریں لکھ کر 5 سطریں غائب کر کے نئے جملے ''آپ کی مزید اطلاع کے لیے عرض ہے'' سے جوڑ دیتے ہیں اور پوری تحریر لکھ کر یہ تاثر دینا چاہتے کہ سلیم شاہ صاحب دراصل لفظ قرأت کو درست ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں چنانچہ انہوں نے ہماری ادھوری تحریر سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے یوں تبصرہ فرمایا: ''طرفہ تماشا یہ ہے کہ جناب سلیم شاہ صاحب نے لفظ 'قرأت' کو درست ثابت کرنے کے لیے اردو اور انگلش ڈکشنریوں کے حوالے دینا شروع کر دیئے۔ سلیم شاہ صاحب جیسے محقق اگر فارسی پشتو کی کسی ڈکشنری کا بھی حوالہ دے دیتے تو ہمیں حیرت نہ ہوتی۔ (ص ۶۳۳)

اگر یہ صرف حافظ صاحب کے فہم کا قصور ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ سخن فہمی عالم بالا معلوم شد' مگر یہ جان بوجھ کر تحریر میں تحریف کر کے غلط نتیجہ نکالنے کی کوشش ہے۔

چیلنج کرنا کوئی علمی وطیرہ نہیں اور آج سے قبل ہمارا یہ رویہ تھا بھی نہیں مگر اس کا کیا کیجئے کہ واسطہ آن پڑا ہے ایک 'مولوی' کے ساتھ جو بدقسمتی سے 'غیر مقلد' بھی ہے اور یوں کسی اصول کا پابند بھی نہیں۔ درج ذیل نکات کے جوابات ''رشد'' میں نہیں آ سکے اس لیے ہم چیلنج کرتے ہیں کہ درج ذیل نکات کا جواب پیش کریں۔

ا۔ ہم نے محترم غامدی صاحب پر اہلِ رشد کا اعتراض نقل کیا تھا۔ یہ اعتراض اور عنوان خود اہلِ رشد کا ہی قائم کردہ تھا جو یوں تھا:

''غامدی صاحب کی عربی دانی: غامدی صاحب قراءات متواترہ پر تنقید کا شوق فرما رہے ہیں اور کیفیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میزان میں ص ۲۵۔۳۳ تک 'قرأت' کا لفظ اپنی بحث میں تقریباً 34 دفعہ لے آئے اور ہر دفعہ انہوں نے اس لفظ کو 'قرأت'' ہی لکھا' گویا انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ لفظ قرأت نہیں بلکہ 'قراءت' ہوتا ہے جس کی جمع 'قراءات ہے''۔ (رشد ا' ص ۴۹۶)

ہماری تحریر اس اقتباس سے شروع ہوتی ہے اور جو 5 سطریں حافظ صاحب نے جان بوجھ کر نکال دیں وہ ہم دوبارہ درج کئے دیتے ہیں تاکہ پورا مفہوم سامنے آ سکے۔ حذف شدہ سطریں یہ تھیں: ''دیانتداری کا تقاضا تو یہ تھا کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ جو آپ لوگوں کے نزدیک منکرِ حدیث تھے' کے مضمون کو نقل کرتے وقت یہ نشاندہی بھی کر دیتے کہ انکی عربی دانی بھی ویسے ہی ہے (جس طرح غامدی صاحب کی ہے) کیونکہ مذکورہ مضمون (رسائل ومسائل حصہ سوم صفحہ (120 تا 133) میں بھی لفظ قرأت (جمع قرآتین) اسی شکل میں موجود ہے۔ اس کی تفصیل ہم بتا دیتے ہیں۔ یہ لفظ صفحہ 126 پر 5 دفعہ' 127 پر 3 دفعہ' 128 پر 6 دفعہ' 129 پر 7 دفعہ' 130 پر 7 دفعہ' 131 پر 8 دفعہ' 132 پر 10 دفعہ اور صفحہ 133 پر 5 دفعہ یعنی مجموعی طور پر 51 دفعہ آیا ہے جو بہرحال جاوید احمد غامدی صاحب سے 17 مرتبہ زیادہ استعمال ہوا ہے۔ لیکن شاید یہ ذکر کرنا آپ کے لیے مفید مطلب نہ تھا۔''

یہ ساری سطریں غائب کر کے انہوں نے یہ

ثابت کیا کہ ہم بھی دراصل یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اصل لفظ قرأت ہی ہے' حالانکہ اسی سے متصل اگلے جملے میں ہم نے یہ جملہ بھی تحریر کیا تھا جسے حافظ صاحب نے کسی مقصد جلیلہ کے حصول کے لیے پھر حذف کر دیا۔ کہ ''ہم آپ کے بیان کردہ لفظ کو غلط نہیں قرار دے رہے بلکہ عرض مدعا یہ ہے کہ دوسرے اہل علم بھی جو لفظ استعمال کرتے رہے ہیں' شاید یہ لفظ اتنا غلط بھی نہ ہو جو کہ دوسروں کی عربی زبان ہی مشکوک ہو کر رہ جائے''۔

اس کا مطلب آپ یہ سمجھے یا زبردستی یہ مفہوم کشید کیا ہے کہ ہمارے نزدیک درست لفظ قرأت ہے نہ کہ ''قراءت''۔ آپ لفظ غلط نہیں کہہ رہے مگر یہ کون سی منطق ہے کہ غامدی صاحب نے صرف ۳۴ دفعہ یہ لفظ استعمال کیا اور وہ عربی میں جاہل ٹھہریں اور مولانا مودودیؒ نے 51 دفعہ یہی لفظ استعمال کر کے آپ کے نزدیک اتنے مستند کس طرح بن گئے؟ عربی زبان میں جاہل ہیں تو دونوں' سہواً غلط لکھ گئے ہیں تو کسی کی عربی دانی مشکوک نہیں ہو سکتی۔ اس کا جواب بہرحال ان کے ذمے ہے۔

۲) ہم نے اپنی تحریر میں کئی اور نکات اٹھائے تھے جن کے جوابات حافظ صاحب اور عمران اسلم صاحب نہیں دیتے۔ وہ درج ذیل ہیں:

۱) ہم نے اپنے مضمون میں اداریہ نویس کی اختلافِ قراءات کی بے شمار ''حکمتیں گنوائی تھیں یعنی کہ سورۃ النساء۔۱۲ آیت میں ''اخ'' اور ''اخت'' میں ابہام ہے جو دوسری قراءات میں ''وله اخ او اخت من ام'' کہہ کر دور کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح کا ابہام سورۃ المائدہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اس میں ''او تحریر رقبہ'' کے الفاظ آئے ہیں لیکن ''رقبہ'' کی وضاحت موجود نہیں کہ غلام میں کوئی تمیز ہے کہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم یا کسی بھی غلام کو آزاد کیا جا سکتا ہے؟ تو قراءات کا اختلاف ہمیں بتایا ہے کہ اس ضمن میں غلام کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ بنابریں ہم کہتے ہیں کہ کسی بھی مسئلے کی تفسیر میں ایک قراءات سے معنی اس طرح واضح نہیں ہوتے (رشد ج ۱' ص ۳)

ہمارا سوال اب بھی باقی ہے کہ اگر کسی بھی مسئلے کی تفسیر میں ایک قراءات کافی نہیں تو دو باتیں سمجھا دیں۔ اولاً کہ ہر مسئلے میں (بغیر کسی استثنا کے) اختلاف قراءات کیوں نہیں تا کہ ہم غیر مبہم مفہوم اخذ کر سکیں؟ ثانیاً اللہ میاں نے مبہم قراءات نازل ہی کیوں فرمائیں؟ ان کے بجائے غیر مبہم والی قراءات ہی کیوں نہ نازل فرما دیں؟

۲) ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی صاحب نے' نبی اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں مکمل قرآن جو لکھوایا تھا اس کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ ''مابعد ادوار میں قرآن یا اس کے لفظوں کے حوالے سے کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو کوئی ایسا معیار موجود ہو جو اختلافات کی صورت میں بطور معیار موجود ہو'' (رشد ح ۲' ص ۸۳۳) لیکن اگلے ہی صفحے پر حضرت عثمانؓ کے جمع کردہ قرآن کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں کسی مصدقہ مصحف کی عدم موجودگی کی وجہ سے تغیری کلمات کا اختلاف بھی زوروں پر تھا۔'' (رشد ح ۲' ص ۳۳۴)

ہمارا سوال اس وقت بھی تھا اور اب بھی ہے کہ وہ قرآن جو اختلافات کی صورت میں بطور معیار کام آنے والا تھا اور جسے خود نبی ﷺ نے لکھوایا تھا وہ حضرت عثمانؓ کے عہد تک پہنچتے پہنچتے غیر مصدقہ ہو گیا تھا یا عدم موجود؟ اس کا سیدھا اور دوٹوک جواب دینے کے بجائے عمران اسلم صاحب نے اسے بھی ہمارا قصور گردانا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

سید صاحب نے یہاں دو جملوں ''ایسا معیار موجود ہے جو اختلاف کی صورت میں کسی مصدقہ مصحف کی عدم موجودگی'' کو نشانے پر رکھتے ہوئے اس میں کجی کی صورت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ قارئین کرام اگر جمع قرآنی کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ اور مابعد ادوار کی تمام کیفیات پیش نظر رہیں تو اس قسم کے خیالات کا ابطال کرنے میں دیر نہیں لگے گی''۔ (رشد ح ۳' ص ۶۵۴)

ہم نے اپنے مضمون میں صاف طور پر لکھ دیا تھا کہ چنداں پریشانی کی ضرورت اس لیے نہیں کہ غلط اور خلاف حقیقت موقف پر ہٹ دھرمی اور اصرار سے ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ غالباً اسی لیے اس کا کوئی دو ٹوک جواب دینا مناسب نہیں سمجھا گیا۔

۳) ہم نے یہ بھی لکھا تھا کہ حافظ زبیر صاحب نے محمد ابراہیم میر محمدی کے مضمون کا ترجمہ کیا ہے جس میں لکھا گیا کہ ''گولڈ زیہر اور نولڈ کے اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن اور قراءات الگ الگ ہیں'' نیز یہ کہ اسی قسم کا قول متجددین میں سے ایک ایسے شخص کا بھی ہے جو اپنے آپ کو فکرِ اصلاحی کا نمائندہ تصور کرتا ہے۔ پس فکر اصلاحی کے نمائندے کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن اور قراءات دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی دلیل ان کے پاس موجود نہیں۔ (رشد ح ا' ص ۴۳۳' ۴۳۴)

اسی مسئلے میں حافظ حمزہ مدنی صاحب اسی جلد (ص 248) میں فرماتے ہیں کہ ''قرآن'' اور قراءات میں فرق ہے۔ قرآن کہتے ہیں ان الفاظ کو جو منزل من اللہ ہے اور قراءات اسی قرآن کی خبر کو کہتے ہیں۔ ان کی تائید میں ''رشد'' ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب کو بھی لے آتا ہے جن کا ارشاد ہے۔ ''قرآن اور چیز ہے اور قراءات اور چیز ہے۔ قرآن تو اس چیز کا نام ہے جو مصاحف کے اندر ثبت ہے اور رسول ﷺ پر نازل کیا گیا اور تواتر سے نقل ہوتا چلا آیا ہے۔ جبکہ قراءات زبان سے اس کی ادائیگی کا نام ہے۔ قرآن ایک ہے اور قراءات متعدد ہیں'' (رشد ح ا' ص ۱۳۹)

ہمارا سوال اب بھی برقرار ہے جس کا جواب ہمارے ناقدین نے نہیں دیا کہ قرآن اور قراءات کو اگر جاوید غامدی صاحب علیحدہ علیحدہ چیزیں قرار دیں تو یہ دعویٰ بلا دلیل ٹھہرے اور وہ متجدد کہلائیں۔ لیکن یہی دعویٰ حافظ حمزہ مدنی صاحب اور ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب کریں تو ہم انہیں کن الفاظ سے یاد کریں' حافظ زبیر اور عمران اسلم صاحب یہ الجھن حل کر دیں مہربانی ہوگی۔ تاہم ان کی خاموشی ہماری سمجھ میں آتی ہے۔

۴۔ عمران اسلم صاحب نے بہت سے ورق سیاہ کر دیئے' کافی محنت کی کہ ''رشد'' کے تضادات کو دور ہو سکیں

لیکن وائے افسوس! ذرا ملاحظہ فرمائیں:

ہمارا پہلا عنوان یہ تھا کہ سبعہ احرف نے سہولت کس کے لیے فراہم کی گئی ہے؟

صرف اہلِ عرب کے لیے یا پوری امت کے لیے؟ یہ تضاد عمران اسلم صاحب نے یوں دور کرنے کی کوشش کی ہے ''طوالت سے بچتے ہوئے ہم ان تمام عبارتوں کو نقل کرنے کے بجائے صرف اس قدر وضاحت کرتے چلیں کہ سبعہ احرف پر نزول قرآن کی حکمت پوری امت کے لیے آسانی اور سہولت کے طور پر تھی لیکن اس کی وجہ وہ مشقت بنی جو اہلِ عرب کو بعض الفاظ بولنے میں درپیش تھے۔ اب اصلاً مشقت تو اہلِ عرب کی دور ہوئی لیکن سہولت قیامت تک کے تمام لوگوں کو فراہم ہوگئی (رشد ح ۳، ص ۶۴۶) ماشاء اللہ چشم بد دور مگر تضاد کس طرح دور ہو گیا!

عمران اسلم صاحب کو تو ہم کیا سمجھا پائیں گے، قارئین کرام نوٹ کریں کہ حافظ حمزہ مدنی صاحب کا دعویٰ کیا ہے؟ ان کا ارشاد تھا: ''الغرض عربی زبان ہی کے حوالے سے لوگوں میں یہ مشکل پیدا ہوئی تھی اور یہ مشکل تا قیامت اہلِ عرب کے لیے ہی باقی ہے۔ اب میرے اور آپ جیسے لوگوں کے لیے عربی کا کوئی بھی لہجہ ہو تو وہ ہم نے غیر فطری طور پر ہی سیکھنا ہے چنانچہ ہمارے لیے تو کوئی بھی لہجہ مشکل یا آسان نہیں ہے، بلکہ تمام لہجے برابر ہیں'' (رشد ح ۱، ص ۲۴۶)

حمزہ مدنی صاحب فرما رہے ہیں کہ سبعہ احرف نے جو مشکل دور کی تھی وہ عربی ہی زبان کے حوالے سے تھی اور یہ مشکل تا قیامت اہلِ عرب کے لیے ہی باقی ہے''۔ ''تا قیامت اہلِ عرب کے لیے ہی باقی ہے'' کے جملے کو دس بارہ دفعہ دہرائیں تو شاید عمران اسلم صاحب سمجھ پائیں کہ ان کے ارشاد ''سہولت قیامت تک کے تمام لوگوں کو فراہم ہوگئی'' میں اور حمزہ مدنی صاحب کے ارشاد میں کوئی تضاد ہے یا نہیں۔

ہم یہ دونوں جملے اکٹھے لکھیں گے تاکہ کوئی موٹے دماغ والا آدمی بھی ان کے فرق کو سمجھ سکے۔ (الا ماشاء اللہ)

یہ سہولت:

۱) ''تا قیامت **اہلِ عرب** کے لیے **ہی** باقی ہے'' (حمزہ مدنی صاحب)

۲) ''قیامت تک کے **تمام لوگوں کو** فراہم ہوگی'' (عمران اسلم صاحب)

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ پہلے جملے میں ''اہلِ عرب کے لیے ہی'' اور دوسرے جملے میں ''تمام لوگوں'' کے الفاظ پر خصوصی توجہ دیں ہم نے اپنی طرف سے عمران اسلم کی سہولت کے لیے ''اہلِ عرب ہی'' اور ''تمام لوگوں'' کے فانٹ ذرا بڑا کر تو دیئے ہیں لیکن کسی کے دماغ کے اندر گھسانا ہمارے بس کی بات نہیں۔ گھس بھی جائیں لیکن کوئی پھر بھی یہی رٹ لگائے کہ ان میں کوئی فرق نہیں بلکہ ایک جملہ دوسرے کی تفسیر کر رہا ہے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں سوائے اس کے کہ

تو خوب سمجھتا ہے نگاہوں کی زباں کو

کہنے کو بہت کچھ ہے مگر کچھ نہ کہیں گے

ضمناً حافظ زبیر صاحب کے طبع نازک پر اگر گراں نہ گزرے تو ان کی خدمت میں عرض کردوں کہ ابن انشاء ہی یہاں آپ سے مخاطب ہیں جن کی نگارشات کو آپ تمسخر اور تحقیر پر محمول کرتے ہیں!

۵۔ سبعہ احرف کا مفہوم: ہم نے رشد کے قلم کاروں کے چند اقتباسات سامنے لائے تو عمران اسلم صاحب کا خیال ہے کہ ہم نے ان میں قطع و برید کی ہے ورنہ یہ مفہوم تو حل ہو چکا تھا۔ آپ فرماتے ہیں: ''سید سلیم شاہ صاحب کی عبارتوں میں قطع برید ملاحظہ کیجئے کہ عبدالقاری تو سبعہ احرف کے مفہوم کی شافی وضاحت کے لیے علمائے و محققین کی جانب رجوع کا درس دیں اور سید صاحب بھرپور ملمع سازی اور فریب کاری کے ذریعے ان کی پوری عبارت نقل کرنے کے بجائے ایک جملہ ذکر کر کے نعرہ بلند کر دیں کہ اس چیستاں کا کوئی مفہوم دریافت ہی نہیں ہو سکا'' (رشد ح ۳، ص ۶۴۸)

قارئین کرام خود یہ اقتباس پڑھ کر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ عبدالقاری صاحب کی پوری تحریر خود عمران اسلم صاحب نے لکھ دی ہے، اس میں وہ خود دیکھ سکتے ہیں وہ کس بے بسی کا اظہار کر رہے ہیں۔ بجا کہ انہوں نے اس سعی لاحاصل کے لیے محققین کی طرف رجوع کا مشورہ دیا ہے مگر اپنی بے بسی کا اظہار تو سامنے کی بات ہے۔

اس مسئلے کے حل کے لیے رشد ح ۱ میں اداریہ نویس نے جو کاوشیں کی تھیں ان کا ہم نے خصوصی ذکر کیا تھا۔ اس ضمن میں ہم نے حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب کا بھی ارشاد نقل کیا تھا کہ ''یہ اختلافات دراصل لب و لہجہ کا فرق ہوتا ہے جو اردو میں بھی مثلاً ناپ تول و ماپ تول، خسر و سسر، انگریزی کا لفظ شیڈول اور سکیجوئل''۔ اس پر ہمارا جو تبصرہ تھا اسے دونوں حضرات نے بالکل گول کر دیا۔ ہم چاہیں گے اس بارے میں بھی اگر عالمانہ ممکن نہ ہو تو مولویانہ ہی جواب دے دیں۔

چیلنج کے عنوان کے تحت ان 5 نکات پر دونوں حضرات نے یا تو خاموشی اختیار کی یا تحریف کر کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ ان مضامین کا خود تقابلی جائزہ لے کر کوئی نتیجہ نکالیں۔

عمران اسلم صاحب نے اپنا مضمون ان جملوں پر ختم کیا ہے:

''اخیر میں سید صاحب سے ہم یہی عرض کریں گے کہ جناب حدیث سبعہ احرف کے مفہوم سے متعلق بحث معرکۃ الآراء مسائل میں سے ہے جس کی تشریح و تعبیر میں اہلِ قلم کے متعدد اقوال موجود ہیں'' (ص ۶۵۵)

ہم بھی درج بالا 5 نکات کے علاوہ ان سے چند سوالات پوچھ کر اپنی گزارشات ختم کر دیں گے۔

۱) پہلی گزارش تو یہ ہے کہ پورا قرآن مجید سات حروف پر نازل ہوا ہے۔

اب اس قرآن مجید میں چھ ساڑھے چھ ہزار کے لگ بھگ آیات موجود ہیں۔ ان میں سے کوئی چار پانچ

آیات مسلسل سات حروف پر بتا دیں تا کہ ہم کوئی ٹھوس نتیجہ نکال سکیں۔

۲) رشد کی پہلی جلد کے صفحہ ۶۷۸ پر کلیہ القرآن الکریم' جامعہ لاہور الاسلامیہ کے عنوان کے تحت ہمیں بتایا گیا تھا کہ:

''کلیہ القرآن' جامعہ لاہور الاسلامیہ نے جہاں خدمت قرآن کے بہت سے سلسلے شروع کر رکھے' وہاں جمع کتابی کے سلسلہ میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا اور اس میں وہ کام کیا ہے جو کہ تاریخ اسلام میں اپنی نوعیت اور جامعیت کے اعتبار سے یگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ وہ یہ کہ قراءات قرآنیہ عشرہ متواترہ' جو کہ کلیات اور مدارس میں صدیوں سے پڑھائی جاتی رہی ہیں اور جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کہ قوائد و ضوابط اور پڑھنے کے انداز تو کتبِ قراءات میں موجود ہیں' لیکن باقاعدہ مصاحف کی شکل میں موجود نہیں ہیں' کلیہ القرآن الکریم' جامعہ لاہور کے فضلاء میں سے تقریباً بارہ محقق اساتذہ نے محنت شاقہ فرما کر تین سال کے عرصہ میں وہ تمام غیر متداولہ قراءات میں سولہ مصاحف تیار کر لیے ہیں اور جیسا کہ راقم نے پہلے عرض کیا ہے کہ یہ کام اپنی نوعیت اور جامعیت کے حوالے سے تاریخ اسلامی کا پہلا کام ہے۔''

اس اقتباس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ غیر متداولہ قراءات میں سولہ قرآن تیار کر لیے گئے ہیں اور یہ کام پہلا کام ہے جو تاریخ اسلامی میں ظہور پذیر ہوا۔

حضور صرف یہ سمجھا دیں کہ رشد ج ۳' کے صفحہ ۶۳۰ پر حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب کو مولانا تقی عثمانی صاحب کے خط کے جواب میں یہ جھوٹ بولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کہ ''میں اپنے ادارہ کی طرف سے آپ کو یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں مختلف قرآءتوں میں قرآن شائع کرنے کا ہمارا کوئی پروگرام نہیں ہے''۔

ناراض ہونے کی بات نہیں۔ اِدھر اُدھر مارنے کے بجائے سیدھی طرح میرے اٹھائے ہوئے سوالات کے متعین جوابات دے دیں۔ رشد نہ ہوتا کوئی اور ہوتا تب بھی اس سے یہی گذارش کرتے۔

تم ناحق ناراض ہوئے ہو' ورنہ میخانے کا پتہ
ہم نے ہر اس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے

خریدار حضرات توجہ فرمائیں

مجلّہ طلوع اسلام کی درج ذیل خوبصورت جلدیں 275 روپے فی جلد علاوہ ڈاک خرچ دستیاب ہیں۔

70, 72, 75, 76, 77, 83, 84, 85, 86, 87, 88, 94, 98, 2000, 2003, 2004, 2005, 2006, 2007, 2008, 2009

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کھاتہ داران حضرات

﴿خصوصی توجہ فرمائیں﴾

جن کھاتہ داران نے اپنے اپنے کھاتوں سے مجلّہ طلوع اسلام جاری کروایا ہوا ہے ان سے گذارش ہے کہ آپ اپنی فہرست خریداران 15 دسمبر 2010ء تک ادارہ طلوع اسلام کو بھجوادیں اور جن کو میگزین سال 2011ء کے لئے جاری رکھنا مقصود ہو یا جن کے میگزین بند کرنے ہوں' مکمل فہرست' ایڈریس کے ساتھ بھجوادیں تاکہ بروقت عمل درآمد ہو سکے۔ شمارہ کی اشاعت میں اضافہ آپ کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ پاکستان میں یونیورسٹیز' کالجز کی لائبریریوں کو لندن بزم و ناروے بزم کے تعاون سے 100/100 میگزین بھیجے جا رہے ہیں جو کہ بہت کم تعداد ہے۔ اگر بیرون ملک یا اندرون ملک کی بز میں مزید تعاون کریں تو اس تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوسکتا ہے اور پاکستان کے تمام تعلیمی اداروں میں میگزین بھیجنا ممکن ہو سکے گا۔ امید ہے کہ بز میں اس مسئلہ پر تعاون کریں گی۔

کھاتہ داران جن کے ذمے طلوع اسلام کی رقم بقایا ہے ان کو ان کے کھاتوں کی تفصیل بھجوائی جا رہی ہے تاہم اگر کسی وجہ سے یہ ان تک نہ بھی پہنچے تو بھی تمام کھاتہ داران سے التماس ہے کہ وہ اپنے کھاتوں میں معقول رقم جمع کرانے کا اہتمام کریں تاکہ واجب الادا رقوم کی وجہ سے ادارہ مالی پریشانیوں کا شکار نہ ہو۔

بینک اکائونٹ کے لئے ضروری وضاحت

1- بینک کا اکاؤنٹ نمبر۔ 3082-7

2- بینک کا نام۔ نیشنل بینک آف پاکستان' مین مارکیٹ برانچ گلبرگ' لاہور (پاکستان)۔

3- نام اکاؤنٹ۔ ادارہ طلوع اسلام

شکریہ

چیئرمین ادارہ طلوع اسلام لاہور

DEEPAK CHOPRA'S CLOAKED ASSAULT ON ISLAM

By

Abdus Sattar Ghazali

==========

In recent months a growing anti-Islam and anti-Muslim bigotry is sparked by the opposition to the planned Park51 project popularly known as the Ground Zero Mosque on Manhattan Island, in New York City. The inflammatory rhetoric surrounding the project has stirred hatred toward Muslims in America. There has been so much fear-mongering and so much misinformation in the debate peddled by bigots and rightwing politicians. The constant vilification of Islam and Muslims over the air on radio talk shows, in newspapers and the Internet is contributing to the rise in anti-Muslim sentiment across the country.

Apparently, to seize the opportunity of anti-Islam and anti-Muslim feelings, Dr. Deepak Chopra has launched his invective against Islam under the title: "Mohammad – A story of the last prophet." As his publisher Michael Morrison, president of HarperCollins said: "As the publisher, we want our titles to be available in a timely manner to meet consumer demand and increase readership for our authors." Dr. Deepak Chopra, well known for his controversial Quantum Healing theory which Dr. Stephen Barret describes as Ayurvedic Mumbo-Jumbo, has also written on two great religious personalities, Buddha and the Jesus.

Not surprisingly, Chopra's book contains distorted facts, half truths, disinformation, misinformation and twisted stories. Tellingly to cover all this he says that this book – Mohammad: A biography of the Last Prophet – is a novel. I don't believe that Chopra lacks knowledge about Islam because he seems to have done his research and has sufficient information to contradict the Islamic beliefs to provoke the Muslims.

Deepak Chopra has followed the centuries old pattern of the so-called Orientialists to denigrate Islam. The Orientalists, who helped the imperialists to legitimize their conquests, argued that Mohammad was an imposter and the Quran a fabrication. The aim of the character

assassination of Prophet Muhammad was that if this could be achieved, the validity of the Prophet would be discredited. For the French and British colonialists who colonized Muslim countries many times larger than their own, Arabic and Islamic studies became a guide for the "pacification of the colonized territories as a means to achieve their colonial objectives." (Benaboud, "Orientalism and the Arab Elite," p. 6.)

In his book, Chopra attacks both - personality of the prophet as well as Islam's holy book, the Quran.

About Quran he says: Mohammad's followers were disconcerted, but quickly began to assemble a complete, authorized Koran from all existing surahs. The compilation (of Quran) went through struggles and arguments, needless to say, leaving enough disputes to occupy generations of scholars and interpreters. (p-259) In an article about his book published in Huffington Post on Sept 27, Dr. Chopra writes: "The very notion that the Quran should never be translated from the Arabic and never commented upon was born (so far as I can ascertain) among his followers after the Prophet's death. As a result, the other people of the Book have passed through reform movements and adaptations that have been denied to the Muslim faithful." I am not sure if his assertions about the Quran are deliberate or because of lack of knowledge. However the fact is that many verses of the Quran were translated in the lifetime of the Prophet. It has been reported that when Jaafar ibn Abu Talib (cousin of the Prophet) recited the first forty verses of chapter Mary (Maryam) in the court of emperor Najashi of Abysinnia, these verses were translated then and there into the local language Amharic. Musa ibn Sayyar Al-Aswari is credited with the oral translation of the entire Quran into Persian.

Chopra's loaded remarks about the Quran echo the systematic campaign against Islam and the Quran launched by a semi-official US think tank, the Rand Corporation which released a study in March 2004 titled "Civil Democratic Islam: Partners, Resources, and Strategies." It was written by Cheryl Benard, a sociologist and fiction writer. Benard suggests that the Moderanists are our allies in the Muslim world. With the goal of selectively ignoring or rejecting elements of the original religious doctrine of Islam she also defines parameters for Muslim modernists: (1) Modernists believe that some verses (suras) may have been falsely or inaccurately recorded in the Quran. (2) Modernists believe that the Quran is legend. Benard questions the authenticity of the Qu'ran itself.

In the chapter on "The Hadith Wars" she says that two verses were lost in the process of recording of the Quran after the death of the Prophet. To authenticate her argument, she quotes from chapter 11 of an eminent scholar of Islam, Allama Ghulam Ahmed Parwez's book entitled: The Status of Hadith . . . The Actual Status of Hadith - Holy Quran According to Our Traditions. Ironically, this chapter is written to refute the premise that the Quran was recorded after the death of the prophet. The references of Hadith in this chapter were given for argument's sake which Benard misquoted to prove her argument. Allama Parwez points out that the Quran was recorded in its present shape during the lifetime of the Prophet. He questions the authenticity of many Hadith which were collected by the Persian scholars more than 200 years after the death of the prophet.

Marriage to Aisha

There has been much criticism from missionaries and Orientalists of Muhammad's marriages. Taking cue from the Orientalists, Dr. Chopra writes: "At the age of six Aisha was betrothed to a husband, until Mohammad has a revelation that she was meant for him. The prospective groom was persuaded to give her up. The marriage to Muhammad took place but was not consummated until Aisha was nine. Beyond Islam, this episode is more than distasteful. Within faith, however, it is praised. None of Muhammad's other wives were virgins, and the rationale is that Aisha served as a kind of Virgin Mary, made all the more pure because she was so young. To the outside world this is a prescription for blind fanaticism." (P-264)

The age of Aisha remains a topic of discussion for a long time. Based on certain ahadith, many Islamic scholars are inclined to accept her age as nine years at the time of consummation of her marriage. However recent research indicates that contrary to what the weak ahadith claimed, at the time of her marriage Aisha's age was 19 years. Quoting historical sources, Allama Ghulam Ahmed Parwez in his biography of Prophet Mohammad (Meraaj-e-Insanyiat) writes: Aisha's half sister Asma was ten years older than her. Asma died at the age of 100 years in 73 AH. She was 27 years old at the time of Prophet's Hijrat (migration) to Medina. Hence Aisha was 17 years old at the time of Hijrat and 19 years old at the time of consummation of her marriage in 2 AH. (p-279 Meraaj-e-Insanyiat, published in 1949)

In a research article – “At what age did Aisha marry the Prophet?” -- Resit Haylamaz, the editor-in-chief of the Istanbul-based Kaynak Publishing Group, also reaches at the same conclusion about the age of Aisha. The article was published In the May-June 2009 issue of the Fountain magazine. (http://fountainmagazine.com/article.php?ARTICLEID=1026)

Massacre of Jews in Medina

Without going into the details of the background of the betrayal of Medina Jews, Chopra writes: As the faithful grew in numbers (in Medina), God told Mohammad to drive Jewish tribes out of Medina, exiling them to marginal wastelands. Later, when Jewish resentment flared up and the last tribe cooperated with the invading army from Mecca, Mohammad exercised violent retribution. All the men were beheaded, and the women and children divided as spoils of war, many to be sold into slavery. This horrifying decision, because it came by revelation, has been praised by Islamic historians. (p-263)

To put Chopra’s sweeping judgment on an important historical event in proper perspective I would like to quote from Karen Armstrong’s book ‘A short history of Islam’ published in 2000. Armstrong writes about this tragic episode: “In Medina, the chief casualties of this Muslim success were the three Jewish tribes of Qaynuqah, Nadir and Qurayzah, who were determined to destroy Muhammad and who all independently formed alliances with Mecca. They had powerful armies, and obviously posed a threat to the Muslims, since their territory was so situated that they could easily join a besieging Meccan army or attack the ummah from the rear. When the Qaynuqah staged an unsuccessful rebellion against Muhammad in 625, they were expelled from Medina, in accordance with Arab custom. Muhammad tried to reassure the Nadir, and made a special treaty with them, but when he discovered that they had been plotting to assassinate him they too were sent into exile, where they joined the nearby Jewish settlement of Khaybar, and drummed up support for Abu Sufyan among the northern Arab tribes. The Nadir proved to be even more of a danger outside Medina, so when the Jewish tribe of Qurayzah sided with Mecca during the Battle of the Trench, when for a time it seemed that the Muslims faced certain defeat, Muhammad showed no mercy. The seven hundred men of the Qurayzah were killed, and their women and children sold as slaves.

“The massacre of the Qurayzah was a horrible incident, but it would be a mistake to judge it by the standards of our own time. In seventh-century Arabia an Arab chief was not expected to show mercy to traitors like the Qurayzah. The executions sent a grim message to Khaybar and helped to quell the pagan opposition in Medina, since the pagan leaders had been the allies of the rebellious Jews. This was a fight to the death, and everybody had always known that the stakes were high. The struggle did not indicate any hostility towards Jews in general, but only towards the three rebel tribes. The Quran continued to revere Jewish prophets and to urge Muslims to respect the People of the Book. Smaller Jewish groups continued to live in Medina, and later Jews, like Christians, enjoyed full religious liberty in the Islamic empires.

“Anti-semitism is a Christian vice. Hatred of the Jews became marked in the Muslim world only after the creation of the state of Israel in 1948 and the subsequent loss of Arab Palestine. It is significant that Muslims were compelled to import anti-Jewish myths from Europe, and translate into Arabic such virulently anti-semitic texts as the Protocols of the Elders of Zion, because they had no such traditions of their own. Because of this new hostility towards the Jewish people, some Muslims now quote the passages in the Quran that refer to Muhammad's struggle with the three rebellious Jewish tribes to justify their prejudice. By taking these verses out of context, they have distorted both the message of the Quran and the attitude of the Prophet, who himself felt no such hatred of Judaism. Muhammad's intransigence towards the Qurayzah had been designed to bring hostilities to an end as soon as possible. The Quran teaches that war is such a catastrophe that Muslims must use every method in their power to restore peace and normality in the shortest possible time.” (p-18,19)

Sufism

Dr. Chopra concludes his diatribe against Islam with an emphatic endorsement of Sufism. He says: “Every Muslim loves the prophet, but one special branch of Islam developed an intense, mystical love for Allah – the Sufis….. Sufis strove for unity with God, and their path to enlightenment was love. Devotion led to rapture, and rapture led to the infinite.” (p-265) “If Muhammad opened the door to God, Sufis were the ones who flung themselves through it, blindly and crying out with passion. This ardent striving is the best interpretation of Jihad, and the one I hope will prevail.” (p-266)

In recent years American think tanks have been recommending to US and European policy makers to support Sufism to counter, what they call, militants in the Muslim world. In 2007, the semi-official RAND Corporation issued a major report titled "Building Moderate Muslim Networks," which urged the US government to form links with Sufi groups that opposed what it called Islamist extremism. The Rand Corporation's 2007 report was a buildup on its 2004 Report titled: "Civil Democratic Islam: Partners, Resources, and Strategies," that called for encouraging the popularity and acceptance of Sufism. The report suggests building up the stature of Sufism by encouraging "countries with strong Sufi traditions to focus on that part of their history and to include it in their school curricula. Pay more attention to Sufi Islam." (p-63) The Rand report further explains: Sufis are not a ready match for any of the categories, but we will here include them in modernism. Sufism represents an open, intellectual interpretation of Islam. Sufi influence over school curricula, norms, and cultural life should be strongly encouraged in countries that have a Sufi tradition, such as Afghanistan or Iraq. Through its poetry, music, and philosophy, Sufism has a strong bridge role outside of religious affiliations. (p-46)

Tellingly, Israeli Ambassador to New Delhi, Mark Sofer, in August last visited the shrine of 12th century Sufi mystic Khwaja Moinuddin Chishti in the town of Ajmer. During the visit the Israeli envoy, according to Indian press report, stressed that Sufism is the only tool which could retain peace and harmony in the world and he wanted that the message of Sufism spread in the world.

Dr. Chopra's emphatic support for Sufism may be read in the backdrop of these reports.

Tellingly, Chopra's tirade against the faith of more than1.5 billion followers around the world is seconded (as the title cover back of the book shows) by such Islam bashers as Ayaan Hirsi Ali and Irshad Mangi. Ayaan Hirsi Ali, who says that she left Islam in 2004, calls the prophet of Islam a tyrant and characterizes Islam as the new fascism. She claims that Islam creates dysfunctional families which constitute a real threat to the very fabric of Western life. In her latest book "Nomad" she argues that a child born in Holland is not bound to be a Muslim just because his parents come from Morocco. (p-251) She also calls on American churches to convert the immigrant Muslims to Christianity by saying that convince the immigrants that "life's challenges can best be overcome with the traditional Christian

values." (p-253) Not surprisingly, she was provided lucrative job by the American Enterprise Institute for her dedication against Islam.

Similarly, Irshad Manji has also "Trouble with Islam" which is also the title of her book. She says that praying towards Mekkah is a sign of being "desert-whipped." In an interview with the British newspaper Times, she said: "What about Islamic imperialism? Eighty per cent of Muslims live outside the Arab world yet all Muslims must bow to Mecca." "The Trouble with Islam", has made her so famous in America that she won the Oprah Winfrey Chutzpah award and got a job as Director of the Moral Courage Project at New York University.

Endorsement of such Islam-bashers only re-affirms the negative tone of Dr. Chopra's latest enterprise about a great religion. The best way to understand something or to critique something is to go and research that topic carefully and make sure that you don't throw away judgments haphazardly. This book is obviously nothing more than an attempt to generate controversy, which generates publicity, which generates book sales. He is clearly jumping on-board the anti-Muslim, anti-Mosque train in the post-9/11 America.

Abdus Sattar Ghazali is the Executive Editor of the online magazine American Muslim Perspective: www.amperspective.com email: asghazali786@gmail

==========

ENGLISH PAMPHLETS BY IDARA TOLU-E-ISLAM

Are All Religions Alike	5
How Sects can be Dissolved?	5
Islamic Ideology	5
Man & God	5
Quranic Constitution in an Islamic State	5
Quranic Permanent Values	5
What is Islam?	5
Why Do We Celebrate Eid?	5
Why Do We Lack Character?	5
Why is Islam the Only True Deen?	5
Woman in the Light of Quran	5
As-Salaat (Gist)	15
Economics System of the Holy Quran	15
Family Planning	15
Human Fundamental Rights	15
Is Islam a Failure?	15
Man & War	15
Rise and Fall of Nation	15
Story of Pakistan	15
The Individual or the State	15
Unity of Faith	15
Universal Myths	15
Who Are The Ulema?	15

ENJOY YOUR STAY AT

HOTEL PARKWAY (PVT.) LTD.

NEAR RAILWAY STATION – LAHORE

ALL COMFORTS AVAILABLE:

- T.V. & FAX
- TELEPHONE EXCHANGE
- LIFT, INTERNET
- AIR-CONDITIONED
- CAR PARKING
- EXCELLENT SERVICE

PH:0092-42-36365908-12, FAX: 0092-42-36311923,

E-mail:hotel_parkway@yahoo.com